تب اور اب

"کیا ہم مسلمان ہیں؟" ـــــــــ ۶۰ء کی دہائی کی بات ہے، مولانا شمس نوید عثمانی کا خونِ جگر تین برس تک سیاہی میں تبدیل ہو کر اس عنوان کے تحت کاغذ پر بکھرتا رہا اور ہند و پاک کے ہزاروں مسلمانوں کے دلوں میں طوفان جگاتا رہا۔ کاغذات سمٹ کر تین جلدوں کی ایک کتاب بن گئے اور برصغیر کے کتنے ہی مسلمانوں نے اسے اپنی کتابِ زندگی کا مقبول ورق بنا لیا۔ میں کسی ایسی شخصیت سے واقف نہیں ہوں جس نے "کیا ہم مسلمان ہیں؟" کا کوئی ایک مضمون بھی اشکوں کا نذرانہ دیئے بنا پورا پڑھا ہو۔ اب بھی کبھی کبھی کوئی قابلِ احترام ہستی ان عاجزانہ الفاظ میں اظہارِ خیال کرنے والی مل جاتی ہے کہ "ہم تو مسلمان ہی اس کتاب کو پڑھ کر ہوئے تھے۔" اس وقت مجھے مولانا سے اپنی رفاقت کے باعث اپنے آپ پر رشک آتا ہے۔

تیس سال میں دریاؤں میں کتنا پانی بہہ گیا۔ ایک نئی نسل جوان ہو گئی لیکن یہ سوال بدستور باقی ہے۔ "کیا ہم مسلمان ہیں؟" میں نے سوچا مولانا کا نسخہ اس نئی نسل کو بھی پیش کر دوں۔ لیکن کیسے ـــــ؟ اس کا کور بوسیدہ ہو چکا تھا گو صفحات میں اب بھی بجلیاں بھری تھیں۔ مولانا سے اجازت لے کر میں نے اس پر نیا کور چڑھا دیا جس کے خدوخال کی تفصیل کچھ یوں ہے:

۱۔ زبان کے مشکل الفاظ کو جا بجا ان کے ہم معنیٰ سہل الفاظ سے بدل دیا۔ مولانا کی ادبی زبان کے ساتھ بے ادبی تو ضرور ہوئی لیکن باقی جملہ اپنے اصل انفرادی رنگ میں جوں کا توں رہا۔

۲۔ پچھلی کتاب میں مضامین کی بے ترتیبی ہی اس کا حسن تھی۔ وقت کے ساتھ مذاق کے معیار بدلے۔ نظم کا دور آیا تو مجھے ترتیب قائم کرنی پڑی۔ حضرت ابوبکرؓ کے حالات کو مختلف مضامین سے اٹھا کر ایک مضمون میں یک جا کر دیا اور اسی طرح دیگر خلفائے راشدین اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے واقعات مرتب کیے۔ پیراگراف مقدم و مؤخر بھی ہوئے لیکن مجھے امید ہے کہ روانی اور تاثیر مجروح نہیں ہوئی ہے۔

۳۔ وقت کی رفتار کبھی مدھم تھی۔ پھر وہ پر لگا کر اڑا۔ آج نیو کلیائی ایندھن کے سہارے برق رفتاری کو شرما رہا ہے۔ کتاب کی تلخیص کی ضرورت محسوس ہوئی۔ تین جلدیں پڑھنے کی اب کسے مہلت ہے؟ ایک تہائی حصے جا بہ جا حذف کر دیے۔ دو جلدیں باقی رہ گئیں۔

مولانا نے اپنی روح کی گہرائیوں کا درد اس میں جیسا سمویا تھا وہ اسی طرح آج بھی اس میں باقی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اپنے قلب میں شعلے اور پلکوں پر شبنم کی موجودگی کا احساس کیے بغیر اسے ختم نہ کر سکیں گے۔

ربّ العزت اس مقدس تپش اور متبرک نمی کو جاوداں کر دیجیے۔!

سید عبداللہ طارق

۲ر جولائی ۹۳ء

کتاب کا کتابت شدہ مسودہ تین سال تک طبع ہونے سے رکا رہا۔ اس دوران ۲۶ر اگست ۱۹۹۳ء کو مولانا شمس نوید عثمانیؒ اپنی ابدی منزل کی جانب روانہ ہو گئے

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ——— سید عبداللہ طارق

خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات!

قریش کا پہلا وفد سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابوطالب پر دباؤ ڈالنے میں ناکام رہا تو دوسرا وفد آپہنچا اور یہ مطالبہ پیش کر دیا گیا کہ "اے ابوطالب! تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہمارے دیوتاؤں کا احترام نہیں سکھا سکے ـــــ اس لیے اب ان کو ہمارے حوالے کر دو!"

محمدؐ عربی سے ابوطالب کو اتنی ہی محبت تھی جتنی ایک ہونہار بیٹے سے ہو سکتی ہے۔ حالات کا یہ ہولناک مگر فیصلہ کُن رُخ دیکھ وہ بے بسی کے احساس سے تڑپ اُٹھے۔ ہر طرف تاریکی تھی ـــ مایوسی تھی ـــ خوف اور ہراس تھا۔ لیکن ٹھیک اس وقت جب بے چارگی کے احساس سے ان کا سر سینے پر ڈھلک گیا تھا، ایک نئی امید کی کرن اس اندھیارے میں کوندی ـــــ انھوں نے درد بھری آواز میں آں حضرتؐ کو پکارا ـــ

"لختِ جگر! اب دشمنوں کو دشمنی سے باز رکھنا بوڑھے ابوطالب کے بس سے باہر ہو چکا ہے۔ وہ لوگ میری نہیں سنتے ـــــ لیکن ..... لیکن اے بھتیجے کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تم اس کام سے باز آجاؤ جس نے سارے مکّہ کو تمھاری جان کا دشمن بنا دیا ہے؟"

پاکباز بھتیجےؐ نے چچا کی یہ آواز سنی اور اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ کیا سچ مُچ یہ اُسی ابوطالب کی آواز تھی جس کے سینے میں محمد عربیؐ کے لیے باپ کا دل دھڑک رہا تھا۔ اور ماں کی ممتا جس کی آنکھوں میں محبت کا نور بن کر دمکتی تھی۔

ہاں یہ اُسی ابوطالب کی آواز تھی ـــــ نہیں! یہ دنیا کا آخری سہارا ٹوٹنے کی آواز تھی۔ یہ اس حقیقت کا اعلان تھا کہ سچائی کی راہ میں دُنیا بہت دور تک ساتھ

نہیں دے سکتی اور آخر کار خدا کا نام لے کر چلنے والے کے ساتھ خدا کے سوا کوئی نہیں رہ جاتا۔
ایک گھڑی کے لیے آپؐ کے دل پر وہ سب کچھ بیت گئی جو اتنے ہوش رُبا اور جانکاہ عالم میں ایک انسانی قلب پر بیت جانی چاہیے ـــــ ابوطالب یہ دیکھ کر درد سے بے تاب ہو گئے کہ ان کے الفاظ کا جواب بھتیجے کی بھیگی ہوئی آنکھیں دے رہی ہیں ـــ لیکن اس سے قبل کہ وہ تسلّی کا ایک حرف منہ سے نکال سکتے اِن مقدس آنسوؤں سے عزم و یقین کا بے پناہ نور پھوٹ نکلا۔ جذبات کے مقابلے میں ایمان و یقین کا نہ ختم ہونے والا جوش پوری قوت سے اُبھر چکا تھا۔ ایک انسان انسانیت کی آخری بلندیوں پر کھڑا ہو کر دنیا کی لاش کو اپنے ہاتھوں سے دفنانے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ ایک بے پناہ عقیدت اور شدید حیرت کے عالم میں ابوطالب نے بھتیجے کی آواز سُنی ـ

"میں نے جو کام شروع کیا ہے وہ میری اپنی موت یا اس کام کے مکمل ہونے سے ایک لمحہ بھی پہلے روکا نہیں جا سکتا۔ چاہے یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے میں چاند ہی کیوں نہ رکھ دیں!"

کِتنی سچّائی، کیسی بے تابی اور کس قدر یقین و اعتماد تھا اِن الفاظ میں ـ! فولادی ارادہ کے سانچے میں ڈھلے ہوئے الفاظ ـــــ ابوطالب نے خوب محسوس کر لیا کہ محمدؐ کے سینے میں یقیناً کوئی ایسی قیمتی شے موجود ہے جو ان کو اپنی جان سے بھی زیادہ پیاری ہے۔ کاش وہ یقین کر سکتے کہ یہی محمدؐ کا خدا تھا ـــ! کاش ان کے لبوں سے کلمۂ حق کی شہادت بلند ہو جاتی! لیکن وہ خونی تعلق کے جوش میں جس قربانی تک جا سکے، وہ الفاظ یہ تھے:

"نہیں نہیں! تم شوق سے اپنا کام کیے جاؤ بیٹا! بوڑھا ابوطالب تمھارے ساتھ ہے۔ ہر حال میں وہ تمھارا ساتھ دے گا۔"

آہ! ابوطالب اور اُن کی قربانی کی یہ دردناک کہانی! جس سچائی کی راہ کے لیے

وہ اپنی جان پر کھیل رہے تھے اس سے محروم ان کو دنیا سے جانا تھا!

لیکن خدارا ایک منٹ رُک کر سوچیئے کہ وہ کفر کی حالت میں اسلام پر جس طرح جاں نثار کیے دے رہے تھے کیا ہم اسلام کی حالت میں اس کا دسواں بیسواں حصّہ بھی پیش کرنے کا بَل بُوتا رکھتے ہیں؟ اگر وہ "کافر" تھے تو کیا ہم مسلمان ہیں؟ —

ہاں مسلمان ہیں — مگر ایسے مسلمان جن کے کردار اسلام کے ساتھ بے رحمانہ مذاق کرنے میں مصروف ہیں۔

نئے اور پُرانے طائف

پھولوں سے زیادہ معصوم فطرت، مگر شیطنت کے گھناؤنے ماحول کے ڈھالے ہوئے شریر انسانی بچوں کی بھیڑ۔ شور مچاتی اور تالیاں بجاتی ہوئی —

آوارہ نوجوانوں کے بدمست غول۔ انسانیت کو دہلا دینے والے قہقہے لگاتے ہوئے — بوڑھے چہرے — لاشوں کی طرح بے روح اور گناہ کی طرح تاریک اور بے ضمیر —

اپنی مکروہ طنز بھری جھرّیوں کے درمیان سمٹتے پھیلتے ہوئے — اِس انسانی جنگل میں جنگلی شور کے طوفانی ریلوں کے ساتھ اینٹوں کی اندھا دھند بوچھار!

— بے رحمانہ پتھراؤ، ہاؤ ہو کی حیوانی غراہٹیں!

یہ طائف کی سرزمین پر کس ہستی کا مجنونانہ خیر مقدم کیا جا رہا تھا؟ — آہ کون جانے — کیا آج طائف کے سرسبز میدانوں اور خوش حال محلّوں کی آبادی میں کوئی خطرناک ڈاکو گھس آیا تھا جسے گھیرا جا رہا تھا یا اس وادی کے تاج و تخت پر حملہ آور کسی سردار کو گرفتار کیا جا رہا تھا — یا اس بستی کے سورماؤں نے کسی ایسے "خوفناک کردار" کو دھر لیا تھا جس سے ان کے عیش و آرام خطرے میں تھے۔

آہ نہیں! — ہرگز نہیں!

پتھروں کی ظالمانہ بارش کے نشانے پر کوئی رہزن نہیں، بلکہ دیانت و امانت داری کا ملکی ہیرو اور بین الاقوامی نشان تھا۔ وہ دوستوں اور دشمنوں دونوں کا "امین صادق" تھا! ـــــ ہاں اس بے رحمانہ، آخری حد تک بے رحمانہ پتھراؤ کی زد پر اُس "انسانِ کامل" کے سوا کوئی نہ تھا جس کے نورانی قدموں میں وحشی سردِاروں کا عظیم قریشی وقار سر جھکا کر یہ بھیک مانگ چکا تھا کہ وہ "ایک نئے خدا" کا نعرہ بند کر دے تو وہ اس قابل ہے کہ عرب کا تاج و تخت اس کے حوالے کر دیا جائے۔

یہ وہی پاکیزہ ہستی تھی جس کے اخلاقی انقلاب کے مقدس پیغام کو خریدنے کے لیے ریگستانِ عرب کی حسین ترین دوشیزاؤں کی بولی لگائی گئی تو شیطنت نے یہ دیکھ کر اپنا منہ پیٹ لیا کہ اس عجیب انسان کی رگوں میں جذبات کی نشیلی سنسنی کی جگہ انسانیت اور اس کے وقار کا مقدس خون کھول اٹھا، اور غیرتِ انسانیت کے ایک حسین ترین جوش کے ساتھ اس کے ہونٹوں سے یہ الفاظ نکلے تھے۔ "جس چیز کو چاند اور سُورج کی نذر بھی نہ خرید سکے، یہ دنیا اس چیز کو دنیا کے سامان سے خریدنے کا خواب دیکھ رہی ہے ـــــ آہ یہ لوگ مجھے نہیں پہچانتے!"

زمین و آسمان کا ہر ذرّہ گواہی دے رہا تھا کہ یہ خدا کے رسولؐ کی آواز ہے ـــــ

"انسانو!" اس نے درد بھری آواز میں طائف کی آدم خور بستی کو پکارا۔ "سُن لو کہ خدا کے آخری پیغام کے سوا میرا کوئی پیغام نہیں ہے۔ یہ تمھارے اس خدا کا پیغام ہے کہ زمین و آسمان میں کوئی اس کی پکڑ سے بچ کر نہیں نکل سکتا۔ اس سے پہلے کہ موت انسان کی گناہ آلود لاش کو عیاشی کے محفوظ اڈوں سے گھسیٹ کر شہنشاہِ کائنات کے حضور میں لے جا پٹکے کیوں نہ انسان نعمت کے شکریہ کی بے ساختہ تڑپ کے ساتھ خود ہی اپنے خالق کی طرف دوڑ پڑے۔"

حقیقت کی کیسی دل نشین آواز تھی یہ ـــــ کیسی دلدوز پکار!

مگر گناہ کی سرمستیوں میں انگڑائیاں لینے والے انسانی درندوں نے پاگلوں کی

طرح قہقہہ لگایا، لیکن وہ بھی اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکے "تم! تم ہو خدا کے رسول؟! ـــــ اہاہاہا ـــــ کیا خدا کو اس کام کے لیے تمھارے سوا کوئی اور نہ ملا؟ ہم تو صاف دیکھتے ہیں کہ تم محض ہم جیسے ایک انسان ہی ہو! ایک انسان جو روٹی کھاتا اور پیتا ہے! اور بازاروں میں خرید و فروخت کرتا ہوا دیکھا جاتا ہے!"

یہی تھے وہ انسان کہے جانے والے لوگ جن کی نظر میں خدا کے رسولؐ کا صرف ایک "جرم" تھا۔ اور وہ یہ کہ وہ ایک "انسان" کیوں ہے؟ آہ ـــــ انسان اور انسانیت و بشریت سے اس قدر بیزار! ـــــ مایوس اور اس درجہ مایوس! ـــــ کیا طائف کے اِس المیہ سے بڑا کوئی اور المیہ ممکن ہے؟ ـــــ کاش ہم اس کا جواب "نہیں" میں دے سکتے ـــــ کاش ہم مسلمان "مسلمان" ہوتے! آہ جغرافیہ پر بکھرے ہوئے یہ بے شمار نئے طائف! جہاں ایک بار پھر خدا کے رسولؐ کو رسولؐ جاننے والے یہ کہتے سنائی دیتے ہیں کہ رسالت تسلیم کرنے کے لیے محمدؐ کی بشریت کا انکار کرو ـــــ جہاں ایمان و عمل کی چلتی پھرتی لاشیں اپنے خونی کردار سے ڈھلی ہوئی اینٹیں اور پتھر کے دل اٹھائے ہوئے اس اسلام کی اصلی بنیادوں کو مٹا دینا چاہتی ہیں جس کی تہہ میں طائف میں ٹپکا ہوا لہو" وہ مقدس لہو" جذب ہے۔

طائف کے شیطانی پتھراؤ میں مقدس خون سے رنگین قدموں کی قسم! موجودہ دور کے نئے طائف اور ان کے ہولناک مناظر خدا کے رسولؐ کا "دل" خون کرنے کے لیے کافی ہیں۔

عرش رسا آوازیں

"اے اللہ! میں اپنی بے چارگی کی فریاد تجھی سے کرتا ہوں۔ اے ارحم الرّاحمین! تو ہی ناتوانوں کی پرورش کرنے والا اور تو ہی میرا پروردگار ہے۔ تو مجھے کس کے حوالے

کرتا ہے ؟ کیا کسی اجنبی بیگانے کے، جو مجھے دیکھ کر تیوری چڑھائے۔ یا کسی دشمن کے جس کو تو نے مجھ پر قابو دے دیا ہو ؟ ـــــ خدایا۔ اگر تو مجھ سے خفا نہیں ہے تو پھر مجھے کسی کی بھی پرواہ نہیں ہے۔ تیری حفاظت میرے لیے بس ہے۔ میں پناہ چاہتا ہوں تیرے رُخ کے اس نور کی جس سے تمام اندھیرے کافور ہو جاتے ہیں۔ جس سے دونوں جہاں کی بگڑیاں بن جاتی ہیں۔ میں پناہ چاہتا ہوں اس بات سے کہ مجھ پر تیرا عتاب ہو یا تو مجھ سے روٹھ جائے ـــــ

ـــــ جب تک تو راضی نہ ہو جائے تجھے منائے جانا ضروری ہے۔"

یہ کون کہہ رہا ہے ؟ کس سے کہہ رہا ہے ؟ کہاں کہہ رہا ہے ؟

یہ کس کے در پہ خدا کے رسولؐ کی دل ہلا دینے والی پکار ہے جو آج سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے طائف کی وادیوں میں گونجی تھی اور آج بھی کتاب کے صفحے پر اُترتی ہے تو قلم کا جگر کانپ کانپ جاتا ہے۔ یہ پکار جب خدائے سمیع و رحیم نے سنی ہو گی تو رحمت و غیرت کا کیا عالم ہوا ہو گا ـــــ خدا گواہ ہے کہ کوئی اس کا صحیح تصور تک نہیں کر سکتا۔ تاریخ اتنا ضرور بتاتی ہے کہ ادھر یہ فریاد آپؐ کے معصوم ہونٹوں سے جدا ہوئی تھی اور اُدھر خدا کا جواب آ پہنچا تھا۔ فضائے کائنات کو چیرتے ہوئے دو عظیم فرشتے فرشِ خاک پر آ کھڑے ہوئے۔ ان میں سے ایک خود حضرت جبریلؑ تھے اور دوسرا وہ طاقت ور فرشتہ جس کے شانوں پر خدا نے پہاڑوں کے انتظام کا بوجھ رکھا ہے۔

"السلام علیکم یا رسول اللہؐ!" کمالِ ادب کے ساتھ جبریل امینؑ نے کہا تھا:

"خدا نے وہ ساری گفتگو خود سُنی ہے جو آپؐ اور طائف کے بدبختوں کے درمیان ہوئی اور وہ فرشتہ آپؐ کی خدمت میں بھیجا گیا ہے جس کے سپرد پہاڑوں کا نظام ہے۔ آپ جو چاہیں حکم دیں۔!

بے رحم انسانوں نے جس پیغمبرؐ پر پتھراؤ کیا تھا خدائے ارحم الراحمین نے اس کے قدموں پر پہاڑوں کو لا ڈالا تھا۔ حضورؐ اس بندہ نوازی پر ابھی شکرِ نعمت ہی میں

ڈوبے ہوئے تھے کہ فوراً دوسرا فرشتہ آگے بڑھا۔

"السّلام علیکم یارسول اللہؐ! وہ عرض کر رہا تھا "میں ہی وہ فرشتہ ہوں جو مالکِ کائنات کی طرف سے آپؐ کی حکم کی تعمیل پر مامور ہوا ہے۔ اگر ارشاد ہو تو طائف کے دونوں جانب کے پہاڑوں کو ایک دوسرے سے اس طرح ٹکرا دوں کہ اس سرپھری آبادی کی کچلی ہوئی لاشوں پر رونے والا بھی کوئی نہ ہو۔"

کیسا عجیب وغریب وقت تھا! اے دل والو! ذرا سوچو تو سہی! ایک طرف وہ سنگدل آبادی ہے جس نے ایک انتہائی رحم کھانے والے کو پتھروں سے مارا ہے۔ اس کا انتہائی پاکیزہ اور بے لوث پیغام سن کر وحشیانہ خوشی سے تالیاں پیٹیں اور بغلیں بجائی ہیں، فقرے کسے اور پتھراؤ کیے ہیں۔ دوسری طرف پہاڑوں کی باگ ڈور خدا نے اپنے محبوب رسولؐ کے ہاتھ میں دے دی ہے اور پہاڑوں کے نظام پر مامور دیو پیکر فرشتہ اس سفّاک بستی کے ظالموں کو سُرمہ بنا ڈالنے کے لیے ابرو کے ایک اشارے کا منتظر ہے اور ان دونوں لرزہ خیز مناظر کے درمیان خود وہی رحمۃ للّعالمینؐ حائل ہے جس کے گھائل پیروں سے خون کے فوارے پھوٹ نکلے ہیں، جوتے لہو سے بھر گئے ہیں اور جس کے مظلوم قدم کمزوری سے لڑکھڑانے لگے ہیں لیکن جوں ہی اس کو محسوس ہوا کہ ظالموں کے حق میں خدا عذاب کا فیصلہ کرنے والا ہے وہ اپنے ہر زخم کی کسک کو بھول ہی گیا۔ اس وقت اس کو بس ایک ہی بات یاد تھی کہ میں حق پھیلانے اور انسانوں کو بچانے کے لیے آیا ہوں۔ بے رحموں کی بستی کی طرف اس نے غمناک نظروں سے دیکھا اور اپنے گھائل جسم کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر درد بھرا جواب دیا ــــ

"میں اللہ تعالیٰ سے امید رکھتا ہوں کہ اگر یہ لوگ ایمان نہ لائے تو ان کی نسلوں میں سے ایسے لوگ ضرور پیدا ہوں گے جو اللہ کی پرستش کریں گے۔"

یہ تھا حق کی اشاعت کا وہ اتھاہ درد جس کی برکت سے ایک گناہ آلود بستی عذاب کی لپیٹ میں آتے آتے بچ نکلی ــــ آج پھر دنیا عذاب کی زد پر ہے۔ کاش

ذرا اس وقت کا دھیان تو کرو جب میدان حشر میں ایک طرف ہم اور دوسری طرف خدا ہوگا اَلاَمْرُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰہِ ـــــ جب جرم و گناہ کی ماری انسانیت ہولناک عذاب کی لپیٹ میں آرہی ہوگی اور ہم سب اس کے چشم دید گواہ ہوں گے ـــ جہاں دوسری طرف عرش الٰہی کے خوشگوار سائے میں وہ خوش نصیب لوگ ہوں گے جن کے دن اللہ کی راہ میں اور راتیں سجدوں میں گذری ہوں گی اور اس طرح اس رات کی یاد تازہ ہوگی جو حضورؐ نے ساری دنیا کے غم میں رو رو کر بسر کی تھی۔

ہاں! ابھی ہم یہ سب کچھ سوچ سکتے ہیں، یہ مہلت ایک دن ختم ضرور ہو جانے والی ہے، لیکن ابھی ختم نہیں ہوئی چاہے یہ لمحہ اس کا آخری ہی لمحہ کیوں نہ ہو۔ ہاں ہم ابھی یہ سوچ سکتے ہیں کہ کیا ہم مسلمان ہیں؟ خدا کا شکر ہے کہ ابھی اس نے ہمیں سوچنے سمجھنے اور خدا کی طرف جانے کی مہلت دے رکھی ہے۔ ہے کوئی جو اس مہلت سے فائدہ اُٹھائے؟

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

آہ! ـــــ وہ دونوں!!

کتنی خوفناک تھی وہ رات ـــ

قتل و خونریزی کی انتہائی دردناک اور انتہائی منظم سازش کفر و شرک کی سیاہ کمین گاہ۔ دارُالندوہ سے چلی اور جلوہ گاہِ رسالتؐ کی دیواروں کو چھونے لگی۔ زہرناک تلواریں میانوں سے باہر نکلی جاتی تھیں۔ نفرت و انتقام کا ناپاک خون آگ بھری آنکھوں سے باہر ٹپکا پڑتا تھا۔ پتھروں کے پجاری آج رات طے کر کے آئے تھے کہ سچائی اور امانت کے مجسمے کو آج نیست و نابود ہی کر کے دم لیں گے۔

اب کیا ہو سکتا تھا؟

رسولؐ کے لیے زندہ سلامت نکل جانے کے تمام دروازے ایک ایک کر کے بند کر دیئے گئے تھے۔ چاروں طرف سے مکان انتہائی سفاک قاتلوں کے نرغے میں تھا جہاں موت اپنے جبڑے کھولے زندگی کا راستہ روکے کھڑی تھی۔ کفر نے اپنی دانست میں آج کائنات کے سب سے زیادہ روشن اور مقدس چراغ کو گل کر دینے کا پورا انتظام کر لیا تھا۔

لیکن کہاں! وہ بے خبر اور نادان یہ تو جانتے ہی نہ تھے کہ ابھی ایک سب سے بڑا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ زندگی کے محل کا وہ صدر دروازہ جس کی محرابوں پر آدمؑ سے لے کر محمد صلے اللہ علیہ وسلم تک بے شمار پیغمبروں کی پیشانیوں کا نور اور جگمگاتی ہوئی روحوں کی چمک کبھی نہ دھندلی پڑنے والے نقوش کی شکل میں نقش تھیں۔ وہ دروازہ جس کی اینٹ اینٹ پر یہ ازلی و ابدی کہانی لکھی تھی۔

"موت اور زندگی کا واحد مالک صرف ایک ہے ـــ صرف ایک وہی جس نے نوحؑ کی کشتی طوفان سے نکالی۔ جس نے یونسؑ کو مچھلی کے پیٹ میں بھی مرنے نہ دیا ـــ جس نے موسیٰؑ کے لیے دریا کا سینہ چیر دیا اور جس کی

قدرت کے گھیرے سے کائنات کا ایک ذرہ بھی باہر نہیں۔"

بے شک ننگی تلواریں، خون آشام تیوریاں اور سفاک جتھہ بندیاں آنکھوں کے لیے لرزہ خیز ہو سکتی ہیں مگر اس دل کے لیے ان کی کوئی حقیقت نہیں جس کی اتھاہ گہرائیوں میں یہ عقیدہ جڑیں پھیلا چکا ہو کہ نفع و نقصان کی فیصلہ کن طاقت صرف اور صرف ایک ہستی کے ہاتھ میں ہے اور وہی خُدا ہے ـــ ہاں وہی میرا اکیلا خدا ہے۔

خدا کی قسم! یہی تھا ایمان بالغیب کا وہ فولادی دروازہ جس کو محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا پر مکمل ترین اعتماد کی معصوم شان سے کھولا اور خدا کا حکم پاتے ہی بے خوف و خطر تلواروں کی دھار پر دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے باہر تشریف لے آئے۔ یہ عقیدہ اگر معاذ اللہ کوئی بے بنیاد عقیدہ ہوتا تو سنگین حقائق سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا ہوتا۔ یہ عقیدہ ایک حقیقت تھا جس کے آگے ساری دنیا ایک پریشان خواب سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ سچائی پوری قوت سے سامنے آئی تو جھوٹ اور ظلم کی ساری طاقتیں الٹ پلٹ کر رہ گئیں۔ جو لوگ ماہر جلّادوں کی طرح بپھرے ہوئے کھڑے تھے وہ زندہ لاشوں اور بے حس و حرکت بتوں کی طرح کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ وہ جنھیں خدا نظر نہ آتا تھا خدا کا رسولؐ بھی ان کی آنکھوں کے سامنے ہوتے ہوئے ان کی نظروں سے اوجھل رہا ـــــ اکڑے ہوئے سر بے جان لاشوں کی طرح کاندھوں پہ ڈھلک گئے۔ آنکھیں خوفناک اونگھ سے پتھرا کر رہ گئیں۔ تلواروں کو اٹھانے والے بازو شل ہو گئے۔ کیسی بے بس تھی وہ طاقت جس کے ساتھ خدا نہ تھا! خدا کا رسولؐ کفر کی اس بے چارگی پر زیرِ لب مسکراتا ہوا اپنی راہ پر آگے بڑھ گیا۔

کتنی انقلابی تھی وہ ہولناک رات! ـــ یہی تھی وہ رات جس کی عظمت کا سب سے بڑا حصّہ ابو قحافہ کا بیٹا لے گیا ـــ وہ بیٹا جس کا نام لینے سے پہلے ملائکہ وضو کرتے ہیں۔ وہ بیٹا جو کئی مہینوں سے اُس مبارک گھڑی کا منتظر تھا۔ جب وہ اپنے گھر بار، اپنے عزیز و اقارب اور اپنی پوری دنیا کو پیچھے چھوڑ کر اپنے محبوب، آقا، اپنے سردار محمدؐ ابنِ

عبداللہ کے ساتھ خانہ ویرانی اور ترک وطن کی پتھریلی راہوں میں چرکے اور زخم کھاتا چلا جائے۔ وہ بیٹا جس کا سارا وجود محبت اور اطاعت کے سانچے میں ڈھل کر ایک مجسم سجدہ بن گیا تھا ـــــ جانتے ہیں آپ کون تھا وہ؟ ـــــ ابوبکرؓ ـــــ ایک بار پھر کہنے دیجیے۔ کون تھا وہ؟ ـــــ ابو قحافہ کا بیٹا ابوبکرؓ! ـــــ جس پر صداقت اور طمانیت اور سکینت قیامت تک ناز کرتے رہیں گے۔ محمدؐ کے بعد سب سے بڑا انسان۔

لیکن ابھی چند لمحے صبر کیجیے۔ ابھی تو پُرخطر رات کے دامن میں وہ انسانِ کاملؐ اکیلا ہی چلا جا رہا ہے جسے معلوم ہے کہ میں اکیلا ہو کر بھی اکیلا نہیں ہوں۔ خدائے کائنات میرے ساتھ ہے ـــــ اس کے چہرے پر اس وقت بھی خوف کی کوئی سلوٹ نہ تھی جب زمین اس کے قدموں کے لیے موت کے خطروں سے ہٹ کر تلوار کی دھار بن گئی تھی۔ خون کی گردش نہ تیز ہوئی تھی نہ سست پڑی تھی۔ جسم میں کوئی جھرجھری تک نہ آئی تھی۔ ایمان و یقین کا لازوال نور اس سیاہ رات میں بھی اس کے اس چہرے سے پھوٹا پڑ رہا تھا۔ جس کو دیکھ کر پہلی نظر میں بڑے بڑے سُورما رعب و داب سے تھرتھرائے بغیر نہیں رہتے تھے مگر دوسری نظر میں جس کا جاں نواز تبسّم ایک بھکاری کو بھی اس طرح مانوس کر لیتا ہے جیسے وہ اپنے بہترین دوست کی پناہ میں آ گیا ہو۔

قدم قدم پر اُجڑے ہوئے مکانات احتجاج اور صدمے کی خاموش کراہ بن کر اس کی صداقت کے قدم چوم رہے تھے۔ مکینوں نے آخرت کے زبردست یقین پر یہ رنگینیوں سے بھرپور دنیا قربان کر دی تھی جو انسانی بستیوں سے گھائل کر کے اس لیے نکالے گئے تھے کہ وہ اپنے خالق و مالک کی پرستش کیوں کرنا چاہتے ہیں ـــــ پتھروں کو پُوج پُوج کر انسانوں پر ظلم کیوں نہیں ڈھاتے؟ بچوں کو زندہ کیوں نہیں گاڑتے اور غلاموں کو اپنا جیسا انسان کیوں سمجھتے ہیں؟ یہی تھے وہ لوگ جنھوں نے دوسروں کو لوٹنے کے مقابلے میں خدا کے نام پر خود لُٹ جانا پسند کیا۔ یہی تھے وہ لوگ ایمان جن کی ہر سانس میں بس گیا تھا۔ جو لذیذ دستر خوانوں اور سرد و شیریں پانی کی نہروں کے عین کنارے بھوک

اور پیاس سے جان دے سکتے تھے، مگر اپنے شیشۂ ایمان میں ایک بال بھی گوارا کرنے کو تیار نہ تھے۔

ان دردناک مکانوں کے چاروں طرف دُور دُور تک وہ گھر پھیلتے چلے گئے تھے جہاں خدا کی زمین پر بسنے والے اپنے خدا کو بھول بیٹھے تھے۔ جن کو زندگی کے جال میں پھنس کر خود اپنی موت بھی یاد نہیں رہی تھی، یہ تھے وہ مکانات جو مظلوموں کے اُجڑے ہوئے گھروں سے بھی زیادہ دردناک تھے۔ یہاں مکان آباد تھے لیکن مکینوں کے سینے اُجڑے پڑے تھے۔ یہاں سے اگر زندگی کی کوئی آواز آرہی تھی تو وہ غفلت میں ڈوبے ہوئے خرّانٹوں کی آواز تھی یا پھر ان گنے چُنے مظلوم مسلمانوں کی کراہیں جن کو ظلم وستم کی آہنی زنجیروں میں جکڑ کر خدا کی راہ میں سب کچھ قربان کر دینے سے بھی معذور کر دیا گیا تھا۔

انسانیت کے ان خوفناک ویرانوں سے گذرتے ہوئے حضورؐ کے مقدس چہرے پر گہرے درد کی کسک نمایاں تھی۔ یہ دیکھ کر آپؐ کا دل خون ہو رہا تھا کہ مجھے خدا نے جن انسانوں کو جگانے کے لیے بھیجا تھا ان کے گھروں سے روح و دل کی کیسی تاریکی اُبل رہی ہے جیسے آپ کو یہ خیال تک نہ تھا کہ اس وقت خوں خواروں کی ٹولی خود میرے تعاقب میں ہے جیسے آپ کو صرف یہ رنج تھا کہ مجھ پر ظلم ڈھانے والے خود اپنی جان کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔

یکایک آپ کے اداس چہرے پر روحانی خوشی کا نور پھیل گیا۔ موت اور خودکشی کی اس تاریک دنیا میں دُور سے زندگی کی آواز بھی آرہی تھی۔ ان ویران کھنڈروں میں سامنے ہی ایک ایسا مکان بھی تھا جس کے در و دیوار پر ایک پاکیزہ روح کے روشن سائے خوشگوار چاندنی کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔

جہاں خدا کے ایک بندے کو نیندوں کے نرم و گرم بستر سے کہیں زیادہ پیاری وہ جائے نماز تھی جس پر سجدہ میں گرتے ہی بندگی کی پرسوز پیشانی اللہ کے قدموں کو چھو لیتی ہے۔ یہ حضرت ابوبکرؓ کا مکان ہے۔ بنی تیم کا وہ خوش نصیب نرالا سوداگر جس نے خدا

کی رضا اور حقیقت خریدنے کے لیے اپنا سب کچھ قیمت میں پیش کر دیا تھا۔ یہی تھا وہ مکان جس کی سمت میں آخری رسولؐ کے قدم اٹھ رہے تھے۔ یہی تھا وہ بندۂ مومن جس کے نصیب میں رفاقتِ رسولؐ لکھی جا چکی تھی۔

ایک بار پھر اس پیارے نام لذیذ نام کو دہرانے دیجیے، ابو قحافہ کا بیٹا ابوبکرؓ۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس خطرناک رات کو حضرت ابوبکرؓ کے گھر جا کر یہ انکشاف کیا تھا کہ "آج رات میں خدا کے حکم سے مکّہ سے جدا ہو رہا ہوں" تو آنکھیں صاف دیکھ رہی تھیں کہ حضورؐ کے تعاقب میں کفر و شرک کی کیسی کیسی بلائیں چلی آ رہی ہیں۔ لیکن ایک پل دنیا کی فکر پر ضائع کیے بغیر حضرت ابوبکرؓ نے التجا پیش کی تھی "اے خدا کے رسولؐ! ـــــ مجھے بھی ساتھ چلنے کی نعمت عطا ہو" ـــــ وہ اس خاردار راہ پر ہنستے کھیلتے ہوئے چلے جو اُن کو ساری خدائی سے دُور خدا کی طرف لے جا رہی تھی ـــــ آخرت کا گھر بسانے کے لیے وہ گھر بار چھوڑ رہے تھے۔ خدا کے رسولؐ کے مقابلے میں بیوی بچوں کو خیرباد کہہ رہے تھے۔ ایمان کے لیے دولتِ دنیا لٹا رہے تھے ـــــ ساری دنیا سے دامن جھٹک کر اپنی جان ہتھیلی پر رکھے ہوئے وہ اس شخصؐ کے پیچھے ہو لیے تھے جو پوری قوت سے یقین دلا رہا تھا کہ "اے خدا کے بندو! میرے پیچھے پیچھے آؤ گے تو خدا سے جا ملو گے۔"

غارِ ثور کے دہانے پر وہ دونوں اپنے اپنے اونٹوں سے اُترے۔ غار اپنی ہولناکیوں کے ساتھ منہ کھولے ہوئے تھا۔ لیکن وہ دونوں اس غار میں داخل ہونے والے تھے جن کو خوب یقین تھا کہ ہمارا خدا ہر جگہ ہے اور جہاں خدا ہے وہاں کوئی خوف نہیں۔ خدا اور خدا کے رسولؐ پر جاں نثار کرنے والا بیتابانہ آگے بڑھا اور بے دھڑک غار میں کود پڑا۔ اندر سے یہ والہانہ آواز آ رہی تھی "میرے ماں باپ آپؐ پر صدقے! ـــــ ذرا ٹھہریئے! ـــــ میں اس غار کو درست کر دوں!" فرطِ شوق میں اس نے جیب و گریباں کی دھجیاں کر لیں۔ ان دھجیوں سے غار کے ایک ایک سوراخ کو بند کیا اور

جب خوب مطمئن ہوگیا کہ حضورؐ کی جانِ گرامی کو اب کسی نقصان کا اندیشہ نہیں تو محض خدا کے دَر کا بھکاری جسم پر دھجّیاں لگائے ہوئے دیدۂ و دل میں خدا کی اس انمول امانت کو سمائے غار میں داخل ہوا۔

ذرا ٹھہریئے ـــــ کیا ہم حبیب و داماں کی ان دھجّیوں کی قیمت کا کوئی اندازہ لگا سکتے ہیں جو عقیدت اور جاں نثاری کے پیکر نے غار کے سوراخوں میں اس لیے بھر دی تھیں کہ کوئی موذی جانور اس کے جان سے زیادہ عزیز آقا کو تکلیف نہ پہنچا سکے ـــــ قیمت! العظمۃ للہ ـــــ سورج کی ساری کرنیں مل کر بھی تو فقط ایک دھاگے کا مول نہیں بن سکیں گی۔ آسمانوں کے تمام ستارے، ساری کہکشائیں روشنیوں کے سارے سرچشمے ایک پلڑے میں رکھ دو اور پھر غارِ ثور والے ابوبکرؓ کے دامن کی ایک دھجّی دوسرے پلڑے میں رکھو۔ تم دیکھو گے کہ دوسرا ہی پلڑا جھکا ہوا ہے۔

تو یہی تھا وہ شخص جس کے بیوی بچے ایک خوفناک انتقام کی آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں گھرے ہوئے دُور، مکّے میں پڑے تھے۔ نہ صرف بیوی بچے بلکہ اس کی عمر بھر کی پونجی جو الاؤ کے دہانے پر ڈھیر تھی، لیکن یہی تھا وہ شخص جس کے دل میں ٹھیک اس وقت بھی خدا اور خدا کے رسولؐ کے سوا کسی کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ جب دنیا بھر کی قیمتی چیزیں اس کے دل کا دروازہ پیٹ رہی تھیں۔ جس کے زانو کو محبوب کا تکیہ بننے کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ اللہ اللہ۔ وہ خدا کی سب سے قیمتی امانت جو آج ساری دنیا سے چھین لی گئی تھی وہی ابوبکرؓ کے دامن میں ڈال دی گئی۔ حضرت ابوبکرؓ نے دیکھا کہ ان کے زانو پر حضورؐ کی شکل میں خدا کی قدرت بے حجاب ہوگئی ہے ـــــ بے اختیار ان کی رُوح پکار اٹھی "ہاں میں نے گواہی دی تھی کہ اے محمدؐ! آپ یقیناً خدا کے آخری رسول ہیں ـــــ اور اے غارِ ثور کی دیوارو! سُن لو کہ ایک بار پھر یہی گواہی دینے کے لیے میرا دل تڑپ کر میرے ہونٹوں پر آگیا ہے ـــــ ہاں خدا کی قسم! میرے لیے خدا اور رسولؐ کی پناہ کافی ہے۔"

شہادتِ حق کی ادھر یہ پکار اُٹھی اور ادھر خدا کی اٹل سنت کے مطابق ایک زبردست قربانی نے منہ کھولا ـــ غار کی چھلنی دیواروں میں جو ایک سوراخ باقی رہ گیا تھا اسی کے اندر سے ایک سیاہ ناگ کا پھن نمودار ہوا، لیکن جان لیوا خطرے کی صورت دیکھ کر حضرت ابوبکرؓ کا جذبہ ایثار کچھ اور جاگ اٹھا ـــ وہ جسم وجان جو تھکن سے چور اعصاب کے ساتھ رسول خدا کو راحت پہنچا کر خوشی اور کیف سے سر دھن رہے تھے جسم وجان کی قربانی کے لیے بے قرار ہو گئے۔ یہ بات ان کے لیے موت سے زیادہ سخت تھی کہ رسولؐ خدا کی راحت میں خلل پڑ جائے۔ اس لیے ذرا سی حرکت کیے بغیر انھوں نے پاؤں سے اس خوفناک بل کا منہ بند کر دیا جس سے ناگ سر نکال رہا تھا۔ ایمان کی آزمائش اور سخت ہو گئی۔ سانپ نے زہریلے دانت حضرت ابوبکرؓ کے تلوے میں گڑو دیئے اور سارے خون کو زہر کی کربناک لہروں میں بدل دیا۔ لیکن محبت اور فرض کے محاذ پر جو قدم پہاڑ کی طرح جم گیا تھا وہ ٹس سے مس کیسے ہوتا۔ زہر کی آتشیں لہریں پورے جسم کو کانٹوں اور شعلوں پر گھسیٹ رہی تھیں لیکن ایمان کے تقاضے پھولوں کی سیج بن کر رہ گئے تھے۔ غیرت ایمانی سے ہونٹ سل گئے تھے۔ ایک سسکی بھی تو نہ نکلی۔ ایک جھرجھری بھی تو نہ آئی۔ صرف ایک آنسو ٹپکا ـــ ہائے وہ قیمتی آنسو جس کی تقدیر میں یہ اعزاز لکھا تھا کہ وہ خدا کے رسولؐ کے مقدس رخسار کو چومے۔ اس پر پھیل جائے۔ سارے سمندر مل کر بھی زور لگائیں تو ایسا بیش بہا موتی کبھی پیدا نہ کر سکیں گے۔

اس اشک بے اختیار کے جواب میں رحمتِ خداوندی کو جوش آگیا۔ حضورؐ تیزی سے چونک کر اٹھے اور ابوبکرؓ کی اشک آلود آنکھوں سے وہ آنکھیں چار ہوئیں جس میں انسانیت کی شیرینی اور خدا کی رحمت ستارہ بن کر جگمگایا کرتی تھی۔

"کیا بات ہے ـــ اے ابوبکرؓ؟" انسانیت کے درد سے انتہائی بے قرار آواز حضورؐ کے ہونٹوں پر طلوع ہوئی تو ایک ساعت کے لیے ابوبکرؓ یہ بھی بھول گئے کہ وہ کس کرب سے دوچار ہیں۔

"کچھ نہیں اے خدا کے رسولؐ!" عقیدت و شوق سے لبریز اور درد سے کانپتی ہوئی آواز میں حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا "میرے پاؤں میں سانپ نے ڈس لیا ہے۔" آواز درد کے مارے کانپ رہی تھی لیکن اس میں شکایت نہیں تھی۔ مایوسی نہیں تھی ـــــ حضورؐ نے فوراً اپنا لعابِ مبارک اس جگہ لگا دیا جہاں سیاہ ناگ نے ڈس لیا تھا اور فوراً زہر کا اثر کافور ہو گیا۔ یہ اس ہستی کے لعاب دہن کا خداداد اعجاز تھا جس کے منہ سے وحی کے پھول جھڑتے اور پیغام خداوندی کے انوار ٹپکتے تھے۔

جسمانی آزمائش کے ایمان افروز خاتمہ پر ابھی حضرت ابوبکرؓ کی روح سجدۂ شکر ہی میں پڑی تھی کہ غار کے دہانے پر ایک اس سے بھی بڑی ایمانی آزمائش کی جھلک نظر آنے لگی۔ انھوں نے دیکھا کہ حضورؐ کے جانی دشمن غار کے کنارے تک آ پہنچے ہیں ـــــ سانپ کے پھن مارنے کے بعد بھی جو انسان اپنی موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا سکتا ہے وہ خدا کے رسولؐ کو خطرہ کی زد میں دیکھ کر اس بے چارگی کے احساس سے نیم جاں ہو گیا کہ اس خطرے کو میری جان کی قربانی بھی نہیں ٹال سکتی۔ انھوں نے انتہائی تشویشناک نظریں حضورؐ کی طرف اٹھائیں اور غار کے دہانے پر نظر آنے والے قدموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی کی "اب..... کیا..... ہوگا.... اے خدا کے رسولؐ؟ یہ لوگ اگر ذرا جھک کر دیکھیں گے تو ہم صاف نظر آجائیں گے۔"

کتنی حسین تھی وہ "بے خوفی" جو خدا اور خدا کے رسولؐ کے قدموں پر جان و مال اور اہل و عیال کو قربان کر دینے کے جذبہ بے اختیار نے اس انسان کے چہرے پر ایمان کا نور بنا کر پھیلا دی تھی اور کیا شاندار تھا وہ "خوف" جو خدا کے رسولؐ کی جان کو بے پناہ خطرے میں دیکھ کر اس کے خون کی گردش اور دل کی دھڑکنوں کو نڈھال کیے دے رہا تھا۔ لیکن ٹھیک اس وقت جب ابوبکرؓ جیسے بندۂ مومن کی نظر انسانی بیچارگی کی طرف گئی تھی۔ خدا کا رسولؐ صرف خدا اور خدا کی قدرت کی طرف آنکھیں اٹھائے ہوئے تھا۔ حضورؐ نے بھی اس خطرہ کو دیکھا اور ابوبکرؓ کے الفاظ سنے ـــــ حضورؐ بھی یہ سمجھ رہے

تھے کہ جو خطرہ سر پر آگیا ہے وہ غار میں داخل ہو جائے تو اس بند غار میں نہ مقابلہ کا موقع ہے اور نہ فرار کی کوئی راہ ـــــ لیکن انھیں یقین تھا کہ میں اس وقت بھی اس قادرِ مطلق کے سایۂ رحمت میں ہوں جس کی مٹھی میں ساری کائنات ایک ذرۂ بے مقدار سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔

"فکر مت کرو!" حضورؐ نے بے پناہ سکون و استقلال کی شان سے تسلّی دی۔ "فکر مت کرو۔ ا ـــ خدا ہمارے ساتھ ہے۔" وہ ہونٹ جن کے لعاب سے سیاہ ناگ کا زہر ہلاہل پانی پانی ہو گیا تھا ان ہونٹوں سے یہ الفاظ نکلے تھے یہ الفاظ ہر خوف و خطر کے احساس تک تریاق بن کر پہنچے اور فوراً ابوبکرؓ نے محسوس کیا کہ غار کی بوسیدہ دیواریں لوہے و فولاد ہی قلعہ میں ڈھل گئیں جہاں کوئی بڑے سے بڑا خطرہ پَر نہیں مار سکتا۔ ادھر ان کی روح سے وہی پکار اُٹھی کہ "میرے لیے خدا اور خدا کے رسولؐ کی پناہ کافی ہے۔" اور اُدھر انھوں نے دیکھا کہ غار کے کھُلے ہوئے منھ تک آ پہنچنے والے قدم پلٹے اور ان کی چاپ ریگستان میں گرد کی طرح بکھر کر گم ہو گئی۔ وہ قدم جو پیغمبرؐ کی تلاش میں جنگل جنگل کی خاک چھان چکے تھے۔ جب خدا نے ان کو روکا تو "ایک نظر" کا فاصلہ طے نہ کر سکے! ابوبکرؓ یہ دیکھ رہے تھے اور وجد کر رہے تھے ـــــ کہ حضور کی پیغمبرانہ شخصیت اپنی مکمل ترین رعنائیوں کے ساتھ ان کی نظروں ـــ تنہا ان کی نظروں کے سامنے جلوہ افروز ہے ـــ وہ انسانِ کامل کو ان بے پناہ بلندیوں پر دیکھ رہے تھے جہاں انسان اور خدا کے درمیان سے زمین و آسمان کی ہر شے ہٹ گئی تھی اور پیغمبرؐ کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں کہ اسباب و وسائل کے تمام پردے اٹھا کر خدا کی زبردست قدرت اس غار میں بے پردہ ہو گئی ہے۔

تین دن تک سچ مچ خدا کے سائے میں بسر کرنے کے بعد حضرت ابوبکرؓ آنحضرتؐ کے ساتھ غارِ ثور سے باہر نکلے تو انھیں محسوس ہوا کہ یہ تنگ و تاریک غار نہیں بلکہ ایک وسیع دنیا تھی جہاں قدم قدم پر خدا کی قدرت اور انسان کی بندگی کھُلی آنکھوں سے نظر آتی

رہی تھی۔ وہ غار میں ایمان بالغیب لے کر گئے تھے لیکن باہر آئے تو ایمان بالغیب صدیوں کا فاصلہ تین دن میں طے کر کے عین الیقین اور مشاہدے میں تبدیل ہو چکا تھا۔ جس انسانؐ کو انھوں نے روح و دل کی شہادت سے نبی مانا تھا اس غار میں ان کی آنکھیں اس نبوت کا سراپا دیکھ رہی تھیں۔ غار سے باہر انھوں نے جس خدا کا یقین کیا تھا غار میں وہ خدا خود اپنا یقین دلاتے ہوئے اپنی بے اندازہ قدرت کے چہرے سے حجاب پر حجاب اُٹھا رہا تھا۔ لیکن شاید اس آزمائش کی بھٹی میں تپتے ہوئے بھی ایک آنچ کی کسر باقی تھی ـــــ ابھی ایک ایسا واقعہ بھی پیش آنا باقی تھا جہاں مجرم انسان کی طاقت اور خدائی طاقت کے درمیان غار کی دیواریں اور دنیا کی کوئی ظاہری رکاوٹ بھی حائل نہ ہو پس منظر میں گرد و غبار کا بادل اُٹھا اور ایک زہریلی تلوار کی بجلی چمک کر سر پر آ گئی قریش کے ایک جنگ آزمودہ ہرکارے سراقہ بن جعشم کے گھوڑے کی ٹاپوں سے زمین دہلنے لگی ـــــ یہی تھا وہ بے رحم دشمن جس کو سو اونٹوں کا حقیر انعام ایک پیغمبر کا مقدس سر حاصل کرنے کی دھن میں پاگل کیے دے رہا تھا۔ خطرے کی زبردست بجلی سر پر ٹوٹ پڑنا چاہتی تھی اور پیغمبرؐ کی جانِ گرامی اس بے پناہ خطرے کی ٹھیک زد میں آ چکی تھی۔ حبِ رسولؐ کے متوالے کو ایک بار پھر اس بے چارگی نے تڑپایا کہ میں خدا کی عظیم امانت کو بچانے کی کوشش میں بالکل بے بس ہوا چاہتا ہوں۔

"اے خدا کے رسولؐ!" وہ جاں نثاری کی حسرت میں پکار اُٹھے۔ "دشمن سر پر آ پہنچا ہے۔"

لیکن خدا کے رسولؐ کو خطرہ تو کیا خطرے کا یہ احساس بھی گوارا نہ ہوا ـــــ سکون دل نے اطمینان و یقین کے جلال کی شکل اختیار کر لی اور فرمایا۔ "اے ابوبکرؓ! تو کیا سمجھ رہا ہے اِن دو کو جن کا تیسرا اللہ ہے؟" قدم قدم پر نبیؐ کی تصدیق کرنے والے نے اسی دم نبیؐ کے اشارے کی تصدیق کی اور کامل سکون و اطمینان کے عالم میں ان کی نظر انسانی ساز و سامان سے ہٹ کر خدا کی قدرت پر مرکوز ہو گئی۔ انھوں نے دیکھا کہ ادھر

خدا کے رسولؐ نے اپنے خدا کے سامنے دعا کے لیے ہاتھ پھیلائے اور اُدھر زمین شق ہوئی اور سراقہ کے گھوڑے کے دونوں اگلے پاؤں اس کے اندر دھنستے چلے گئے۔ منہ کے بل گرنے والا کافر اُٹھا ـــــ اُٹھ کر چلا اور پھر گرا ـــــ آسمان والے کا اشارہ پاتے ہی زمین نے اس "مجرم" کو آگے بڑھنے کے لیے راہ دینے سے انکار کر دیا تھا جو بہت جلد "اعترافِ جرم" اور پھر اعترافِ حق تک پہنچنے والا تھا۔ بار بار منہ کے بل گرنے والا سراقہ اُٹھا اور ہاتھ جوڑ کر جان کی امان مانگی۔ جو شخص ظاہری طاقت کے بل پر جان لینے کے لیے آیا تھا وہ خدا کی طاقت سے سہما ہوا خدا کے رسولؐ سے زندگی کی بھیک دامن میں لیے واپس جا رہا تھا۔ دل سے خدا کو قادرِ مطلق ماننے والے بندۂ مؤمن نے آنکھوں سے دیکھا کہ خدا قادرِ مطلق ہے جس کے ایک اشارے پر سب کچھ ہو سکتا ہے وہ سب کچھ جس کا تصور بھی آدمی پہلے سے نہیں کر سکتا۔

اس کے بعد یہ قافلہ سوئے یثرب روانہ ہوا۔

"ہائے یہ قافلہ!" حضرت ابوبکرؓ کا غلام عامر بن فہیرہ سوچ رہا تھا جس کو حضرت ابوبکرؓ نے راہ دکھانے کے لیے اپنے اونٹ پر پیچھے بٹھا لیا تھا۔ "ہائے یہ نرالا قافلہ جس میں دو انسان اور ایک خدا ہے! ـــــ دنیا پوری قوت کے ساتھ اس قافلہ کا پیچھا کر رہی ہے لیکن اس کے نزدیک پہنچ کر بھی اس کو چھو نہیں پاتی! ـــــ" اور یہ قافلہ خدا کی قدرت و رحمت کی سیکڑوں نشانیوں سے گزرتا ہوا ـــــ نفرت و انتقام کی شیطانی طاقتوں سے بچتا ہوا ۱۲ ربیع الاول ۱ھ نبوی میں یثرب سے کچھ فاصلہ پر قبا کے دامن میں پہنچا تو حق و صداقت کے پروانے شمعِ رسالت پر نثار ہونے لگے۔ یہ تھے وہ لوگ جو خدا اور اس کے رسول کے قدموں پر جانیں نثار کرنے کی پرسوز تمنا پر سر دھن رہے تھے۔ جنھوں نے خدا کے لیے ساری دنیا سے جنگ مول لی تھی۔ اپنی ساری دنیا داؤں پر لگا دی تھی۔ لیکن ان پروانوں میں سب سے زیادہ نمایاں اور سب سے زیادہ سپردگی و ایثار کی تپش سے سلگتا ہوا پروانہ وہی شخص تھا جو ہجرت کی پُرخطر گھاٹیوں میں رسالتؐ

کے قدموں کو خونِ دل و جگر سے نکھارتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا اور جس کی زندگی کا ایک ایک سانس رسولِ خدا کی حفاظت میں سینہ سپر رہنے پر صرف ہوتا آیا تھا وہ یہاں بھی چادر تھامے ہوئے حضورؐ پر سایہ کیے ہوئے ساری دنیا سے منھ پھیر کر محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے حسین چہرے کو والہانہ سپردگی کے ناقابل بیان عالم میں تک رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ تنہا اس "ایک چہرے" کو دیکھ دیکھ کر جی سکتا ہے ـــ جیسے اس چہرے کو دیکھتے ہوئے وہ ساری دنیا سے بے نیاز ہو جاتا ہے ـــ جیسے اسے خود اپنے وجود کی طرف بھی ایک نظر اُٹھانے کی فرصت نہیں رہتی۔

اور آج جب وہ چہرہ نظروں سے اوجھل ہے ہماری نظریں ایک بار پھر دنیا اور متاع دنیا کی طرف جم کر رہ گئی ہیں۔ اسلام کو خطرات میں گھرا ہوا چھوڑ کر ہم لوگ اپنے اپنے گھروں کی پناہ گاہوں میں چھپ کر جان بچانے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ ہمیں تمام مادّی وسائل سے امیدیں ہیں لیکن اُسی واحد ذات سے کوئی امید نہیں جو تمام امیدوں کا حقیقی ملجا، و ماویٰ ہے۔ کہنے کو دعائیں اسی سے کرتے ہیں لیکن عمل تمام تر ایسا ہی ہے جو اس کی رحمت و نصرت کو نہیں غیظ و غضب ہی کو آوازیں دیتا رہتا ہے۔ خدا کی پناہ! کہاں وہ اسلام جو گوشت پوست کے انسانوں کو ایک سجدہ مسلسل میں ڈھال گیا تھا اور کہاں یہ ہمارا اسلام جو پیہم بغاوت اور نافرمانیوں کی کبھی نہ ختم ہونے والی کہانی ہے۔

چند لمحوں کے لیے خدارا آنکھیں بند کیجیے ـــ اور سوچیے ـــ کیا ہم مسلمان ہیں ـــ؟

لِلّٰہیت کا پروانہ

حضرت محمدؐ صلے اللہ علیہ وسلم کے بچپن کے گہرے دوست کی حیثیت سے ہمیشہ ان کے دوش بدوش چلنے والے ابوبکرؓ نے جیسے ہی آں حضرتؐ کی زبان مبارک پر رسالت کا دعویٰ اُبھرتا ہوا سُنا۔ وہ ایک غلام کی شانِ انکساری کے ساتھ خدا کے آگے جھکے اور خدا کے رسولؐ کے قدموں کے نشان چومنے کے لیے برابر سے ہٹ کر ان کے پیچھے آگئے۔ دوستانہ برابری کے سالہا سال کے درجہ کو رسالتِ محمدی میں فنا کر دینے کا یہ پُرشوق منظر دیکھنے کی چیز تھا۔

شعلوں کی طرح دہکتی ہوئی اور جھلسا دینے والی ریگستانی راہوں پر دو انسان ہر جگہ ساتھ ساتھ دیکھے گئے! ان میں ایک وہ شخص تھا جس کی امانت و دیانت اور صداقت کی قسم چالیس سال سے مکّے کی گلی گلی میں کھائی جا رہی تھی تو دوسرا وہ تھا جس کو بلانوش شرابیوں کے کافر مکّہ نے کبھی ایک بار بھی نشے میں نہیں دیکھا تھا۔ محمدؐ اپنے خدا کے اشاروں پر بت خانوں اور وحشی ترین انسانوں کی اونچی نیچی دنیا میں جدھر حق کی آواز بلند کرتے ہوئے گذرتے ابوبکرؓ کی بے قرار آواز پیچھے پیچھے بلائیں لیتی۔ لرزتی اور وجد کرتی ہوئی آتی۔

میں گواہی دیتا ہوں! ـــــ اے دُنیا، میں گواہی دیتا ہوں! ـــــ میں تصدیق کرتا ہوں کہ اس آدمی کی رگوں میں قریش کا بہترین خون ہے اس کے قلب و روح میں سوائے نور کے کچھ نہیں ـــ اس کے کردار میں امانت و صداقت کے جوہر کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں۔ میں ایک دو دن نہیں چالیس سال سے اس کی زندگی کے دن اور رات دونوں دیکھتا آیا ہوں اور اس کی شخصیت کو ہر وقت اپنی حدِ نظر سے زیادہ اونچا پایا ہے۔ میں کیسے بتاؤں یہ کتنے اچھے ہیں۔ کتنے سچے ہیں۔ میں ان

کی صداقت کی گواہی دیتا ہوں۔ اے لوگو! میں گواہی دیتا ہوں۔۔۔۔"

توحید و رسالت کی درد بھری آواز سینۂ رسولؐ سے اٹھتی اور شہادت حق کا صدیقی نعرۂ مستانہ خونِ دل و جگر ٹپکاتا ہوا ساتھ آتا ساری دنیا ایک گھڑی کے لیے سکتے میں آجاتی ـــــ آخر کار سنگدلوں نے ان دونوں کو گھور کر دیکھا۔ خود پرستوں کے کان کھڑے ہوئے! ـــــ اور انسان کی جھوٹی خدائی کی ناپاک زنجیروں میں جکڑے ہوئے کتنے ہی غلاموں اور لونڈیوں نے آنکھ میں آنسو بھر کر سسکی لی۔

"ہائے کیسی دل کش ہے یہ آواز کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں۔ کاش ہم اس آواز پر تن من دھن نثار کر سکتے۔ کاش خدا کا کوئی بندہ ہمیں انسانی غلامی سے نکال کر خدا کی بندگی میں داخل کرا سکتا!"

یہ پکار خدا کے اسی بندے کے کان میں پڑی جس کا نام ابوبکر صدیقؓ تھا۔ سنتے ہی وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور عمر بھر کے خون پسینے کی گاڑھی کمائی بے دریغ خرچ کر دی ان بیسیوں غلاموں پر جن سے ان کا خون کا نہیں، مفادات کا نہیں، خالص ایمان کا رشتہ تھا۔ ایک رشتہ اخوت جس میں اپنے اور بیگانے کا کوئی امتیاز نہیں۔ جہاں کسی سے کچھ لینے کے لیے نہیں دیا جاتا۔ بلکہ جہاں دینے والا، لینے والے ہر دروازے کو یہ کہہ کر اپنے ہاتھوں سے بند کر دیتا ہے کہ "تم سے مجھے کسی اجر و صلہ کی طلب نہیں۔ میری روزی میرے رب کے ہاتھ میں ہے۔" خدا کے نہ ماننے والوں نے بھی کبھی ان غلاموں کو خریدا تھا تاکہ اپنی جھوٹی خدائی کا کھلونا ان کو بنا کر سینہ پھلا سکیں اور غرور سے سر اٹھا سکیں۔ ابوبکرؓ جیسے اللہ والے نے بھی ان غلاموں اور لونڈیوں کو منھ مانگے دام دے کر خریدا تھا لیکن صرف اس لیے کہ خدا کے بندوں اور بندیوں کو خدا کی بندگی کی آزادی دلا کر توحید کے آستانے پر جھکا دیں اور ساتھ ساتھ خود بھی سجدۂ شکر میں گر جائیں۔ ان آزادی پانے والوں میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ ہاں ان میں بلالِ حبشیؓ بھی تھے۔ عامرؓ بن فہیرہ تھے۔ ان میں ندیرہؓ تھیں۔ نہدیہؓ اور جاریہؓ تھیں۔

محمدؐ مصطفےٰؐ کے فیضِ نظر نے یہ ابوبکرؓ کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا؟ وہی ابوبکرؓ جو بنی تمیم کے ایک کامیاب سوداگر کی حیثیت سے کبھی سونے چاندی سے دنیا کے ساز و سامان کا مول تول کیا کرتے تھے آج وہی ان کی دولت تھی جس کے عوض وہ دنیا نہیں جنت خرید رہے تھے۔ خدا کی خوشی خرید رہے تھے!

حق و صداقت کے جاں نثاروں کا قافلہ بڑھتا گیا اور حق و صداقت سے چڑنے والوں کی مکروہ تیوریاں چڑھتی گئیں۔ حق کا دعویٰ کرنے والوں کے مقابلے میں اب ظلم و ستم کی قہرمانیت پوری طرح حرکت میں آچکی تھی۔ اب خدا کا نام وہی لے سکتا تھا۔ جس نے سر سے کفن باندھ لیا ہو اور اپنی جان ہتھیلی پر رکھ لی ہو۔

تنے ہوئے گھونسے اور بپھری ہوئی ٹھوکریں اُبھریں اور خدا کا نام لینے والے سے کہا:

"خدا کا نام پیارا ہے یا خاندانی نام و نمود؟ ـــــ یاد رکھو کہ خدائے واحد کا نام لوگے تو اس تمام عزت و شوکت سے ہاتھ دھونا ہوگا جو بنو تمیم کے معزز گھرانے کے ایک معزز ترین فرد کی حیثیت سے تمھیں آج تک حاصل رہی ہے۔"

حضرت ابوبکرؓ نہ مانے ـــــ نام خدا پر دنیا بھر کی ٹھوکریں کھانا قبول کیا۔ آخرت کی سرخروئی کی چاہ کو زمین کی ذلت و رسوائی کا کوئی خطرہ ذرا بھی تو نہ سہما سکا۔ لیکن جیسے ہی دنیائے کفر و شرک نے ان کی ایمان کی دولت کی طرف ہاتھ بڑھایا اور خدا کا نام لینا دشوار کر دیا تو گھر اور وطن ان کو شیطانی قید خانے معلوم ہونے لگے جہاں سے دامن بچا کر وہ جنگلوں کو نکل جاتے اور دیس بدیس کی ٹھوکریں کھانے کی آرزو کرنے لگتے۔

"اے خدا کے رسولؐ! انھوں نے ماہی بے آب ہو کر عرض کیا: دیکھ رہے ہیں آپ؟ یہ دنیا اب میرے ہونٹوں کو سی دینا چاہتی ہے اور مجھے مجبور کر رہی ہے کہ خدا کی بندگی میں آجانے کے بعد خدا کا نام لینا چھوڑ دوں۔

خدارا اجازت دیجیے، کہ اس وطن اور گھر بار کو چھوڑ کر جینے کے لیے کوئی ایسا پُرسکون کونہ ڈھونڈ نکالوں جہاں میری زبان آزادی سے خالق اکبر کا نام پکار سکے۔"

حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ابوبکرؓ کا تمام جسم جراحتوں اور چوٹوں سے پاٹ دیا گیا ہے۔ حضرت طلحہؓ بن عبداللہ کی روح میں ایمان کی جوت جگانے کے جرم میں ان کے چچا نوفل بن خویلد نے طلحہؓ کے ساتھ ابوبکرؓ کو جو دردناک جسمانی مار دی ہے اس کی چوٹوں کے نشانات ان کے جسم پر جگہ جگہ تمتما رہے ہیں۔ حضورؐ نے دیکھا کہ خدا کی راہ میں زخم پر زخم کھانے والا ترک وطن کا ایک اور زخم کھانے کے لیے کس درجہ بے تاب و بے قرار ہے۔ اللہ کے رسولؐ نے ان کو اجازت دے دی کہ تم اگر اسی پر مُصر ہو کہ خدا کے لیے ساری دنیا چھوڑ دو تو خوشی سے سوئے حبشہ ہجرت کر سکتے ہو۔

حضرت ابوبکرؓ نے مکّے کے در و دیوار پر حسرت بھری نظر ڈالی۔ کیسا سخت وقت تھا کہ گھر بار وطن اور اہل وطن چھوٹ رہے تھے۔ سب سے زیادہ یہ کہ خدا کا رسولؐ چھوٹ رہا تھا لیکن کیسا حسین تھا یہ وقت! جب خدا کی طرف بڑھنے والے بندے نے محسوس کیا کہ اس کا خدا خود بھی بہ نفسِ نفیس اس عاجز و درماندہ بندے کی طرف بڑھ رہا ہے وہ ایک قدم بڑھتا ہے تو خدا اس کی طرف دس قدم آگے بڑھتا ہے اور وہ تیز چل کر جاتا ہے تو خدا اپنی عظیم رحمت کے ساتھ بندے کی پذیرائی میں دوڑتا ہوا آتا ہے! کوئی بتاؤ آخر وہ کون سا اعزاز ہے جس کی آرزو اور جس کا تصور اس بندہ نوازی کے بعد کیا جا سکے؟ ہزاروں وطن، ہزاروں بار قربان ایسی بے وطنی پر جس کے قدموں کی دھول میں جنت گری پڑتی ہو۔ ہزاروں دُنیائیں ہزاروں بار قربان اس بے کسی اور غریب الدیاری پر جہاں ساری خدائی چھوٹ رہی ہو اور خدائے قدرداں مل رہا ہو! یہی تھی وہ جاں نواز حقیقت جو اس وقت حضرت ابوبکرؓ صدیق کے جسم و جان میں رچی ہوئی تھی۔ وہ گھر کے ٹھنڈے سائے اور وطن کے زندہ مناظر

سے کٹ کر جلتے ہوئے ریت کے ٹیلوں کے درمیان اکیلے و تنہا قدم قدم پر یہ محسوس کر رہے تھے کہ وہ ہرگز تنہا نہیں ـــــ یہاں بھی کوئی ان کے ساتھ ہے وہی "کوئی" جس کے بعد کسی کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

آگ برساتے ہوئے ریگستان میں مست چلے جاتے ہوئے مومن کو ایک کافر نے دیکھا تو حیران رہ گیا۔ یہ قارہ کا سرمایہ دار ابن الدغنہ تھا۔ اس نے سوچا کہ بنو تمیم کا یہ معزز سوداگر آج کس سفر پر چلا جا رہا ہے جہاں نہ اس کے ساتھ تجارت کا ساز و سامان ہے اور نہ کوئی رفیقِ سفر! لیکن پھر بھی اس کے بشرے سے وہ خوشی اور بے نیازی کا نور ٹپک رہا ہے جیسے تمام دنیا کی حکمرانی اس کو مل گئی ہو۔

"اے ابوبکرؓ، کہاں چلے ؟!" حیرت و تعجب کے ساتھ رئیس قارہ نے سوال کیا۔

"قوم نے مجھے وطن سے نکال دیا ہے۔ اب مجھے خدا کی زمین پر ایک ایسا کونہ ڈھونڈ نکالنا ہے جہاں میں آزادی سے خدا کی پرستش کر سکوں۔"

حضرت ابوبکرؓ کی آواز میں دل کی چوٹ اور ایمان کی جاں نواز مٹھاس تھی! ایمان کیسا بے پناہ تھا۔ یہ منظر دیکھ کر کافر کے سرد و سیاہ سینے میں انسانیت کا سوز جاگ اٹھا۔ درد کی ایک اشک آلود سنسنی اس کے پورے وجود میں دوڑ گئی۔ جذبات سے بوجھل آواز میں ایک کافر کے منہ سے یہ الفاظ نکلے:

"نہیں اے ابوبکرؓ! میں تمھیں کبھی نہ جانے دوں گا۔ تم بیکسوں کی مدد کرتے ہو ـــــ بے نواؤں کی پکار سنتے ہو۔ مہمانوں کے لیے فرش راہ ہوتے ہو۔ نہیں ـــــ میں تمھیں نہ جانے دوں گا! ـــــ آؤ میرے ساتھ واپس چلو میں عہد کرتا ہوں کہ تم میری امان میں رہو گے اور تمھیں خدا کی عبادت کرنے سے کوئی نہ روکے گا۔"

وہی جسے کفر و شرک نے دیس سے نکل جانے پر مجبور کیا تھا۔ ہاں اسی کو پھر دیس میں واپس لانے کے لیے وہی کفر و شرک اس کے پاؤں پڑ رہا تھا ـــــ! یہ کفر کی

صدائے شکست تھی، ایمان و اخلاق کا اعلانِ فتح تھا۔ یہ خدائے بندہ نواز کی قدرت کا ایک نمونہ تھا۔

ابوبکرؓ پھر ایک نئی شانِ خودداری کے ساتھ اس طرح واپس آئے کہ قارہ کا دولت مند سردار ابن الدغنہ ایک ہرکارے کی طرح قریشی سرداروں میں گھوم پھر کر یہ اعلان کر رہا تھا:

"میں اپنی امان میں ابوبکرؓ صالح کو واپس لایا ہوں۔ اے لوگو! تمھیں غیرت آنی چاہیئے کہ تم مکے کو ایک ایسے بھلے مانس سے خالی کر دینا چاہتے ہو جو غمزدوں کی ہمدردی کرتا اور دکھیاروں کے دکھ درد میں جان و مال سے حصّہ لیتا ہے۔"

کچھ دن یہ لوگ اس توقع کے ساتھ حالات کا جائزہ لیتے رہے کہ ایک بار ملک بدر ہو جانے والا دوسری بار جلاوطن ہونے کے ڈر سے اپنے طرزِ عمل میں کوئی احتیاط۔ کوئی تبدیلی پسند کرتا ہے کہ نہیں؟ انھوں نے دیکھا کہ ابوبکرؓ کی دردناک آوازیں ہر رات ان کی "گھریلو مسجد" سے پوری قوت کے ساتھ بلند ہو رہی ہیں تو خدا کو بھول کر میٹھی نیند سونے والے کافروں کے دل ہل رہے ہیں جو آواز کبھی گھر کے باہر مکّہ والوں کو ڈھونڈتی پکارتی پھرتی تھی اب وہی آواز گھر کے اندر یوں بلند ہوتی ہے کہ دنیا اس کی طرف کھنچی چلی آتی ہے۔ قریشی سرداروں کا وفد ابن الدغنہ سے ملا اور اعلان کر دیا کہ اب ابوبکرؓ کو گھر کے اندر رہتے ہوئے خدائے واحد کا نام بلند کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ ابن الدغنہ نے قریشی سرداروں کے غضب ناک تیور دیکھے تو ہانپتا کانپتا ہوا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا:

"کیوں اپنی جان کے دشمن ہوئے ہو؟ — خدا کا نام لے لے کر تم سارے مکہ کو خفا کیے دے رہے ہو۔ مجھے خطرہ ہے کہ اس طرح میں بھی تمھیں پناہ دینے کے عہد کو برقرار نہ رکھ سکوں گا۔"

یہ اعلان ایک زبردست دھمکی تھی۔ یہ دھمکی اس زلزلہ کی دھمک تھی کہ مکے میں خیریت سے رہنا چاہتے ہو تو خدا کی اعلانیہ پرستش سے باز آجاؤ۔ ورنہ یہ طے ہے کہ تمھیں مسل ڈالا جائے گا۔ لیکن وہ مؤمن جو خوب جانتا تھا کہ زلزلہ محشر کیا چیز ہے اور دوزخ کے آتشیں تصور میں کس بلا کی ہولناکیاں ہیں اس نے کمال بے نیازی سے ابن الدغنہ کی باتوں کو سنا ابن الدغنہ کے وہم وگمان پر سکتہ سا چھا گیا جب اس نے اپنے کانوں سے ابوبکرؓ کی یہ آواز سنی:

"مجھے تمھاری پناہ درکار ہی نہیں۔ میرے لیے خدا اور خدا کے رسولؐ کی پناہ بالکل کافی ہے۔"

یا معبود! تیری اس دنیا میں کبھی خدا پر ایمان لانے والا دنیا پر بے نیازی سے لات مار کر خطرات کے منجدھار میں یہ اعلان کر سکتا تھا کہ "اس کو کسی کی پناہ درکار نہیں۔ اس کے لیے تو خدا اور رسولؐ کی پناہ کافی ہے۔" لیکن آج ہمارے تصورات اس بات کو سوچ کر شل ہو جاتے ہیں کہ "کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ کیا خدا پر ایمان لانے والا خدا پر اس طرح عملی بھروسہ کا مظاہرہ کر سکتا ہے؟" لیکن کاش ہم سوچ سکتے کہ یہ باتیں سوچنے کی نہیں، کر گذرنے کی ہیں۔ خدا پر بھروسہ کا لطف اٹھایا ہی تب جا سکتا ہے جب خدا کے لیے خطرات کو قبول کرنے کی جرأت دکھائی جائے۔ آگ اسی وقت پھولوں کی سیج بن سکتی ہے جب کوئی ابراہیم خدا کا نام لے کر آگ میں کود پڑے۔ لیکن ہم چاہتے ہیں کہ خطرہ مول لینے سے پہلے خدا کی پناہ گاہ کا دروازہ ہمارے لیے چوپٹ کھول دیا جائے۔ آگ کے شعلے پہلے لالہ وگل میں ڈھل جائیں۔ پھر ہم الاّ اللہ کر کے اس میں کود پڑیں۔ سچے مومنوں نے کبھی یوں نہیں سوچا۔ اور ہم ہمیشہ ہر وقت کچھ اسی طرح سوچ رہے ہیں!!

خدا کی سمت میں کشاں کشاں زندگی

نئی صحت، نئی زندگی، سارے جگ سے نرالی اخوت اور تازہ دم سدا بہار ایمان کے رنگ و نور سے وادیٔ یثرب میں "مدینہ" نام کی جو ارضی جنت آباد ہو رہی تھی، اب وہاں خدا کا گھر تعمیر ہونا تھا۔ مسجد کی عمارت کے لیے جو جگہ سب سے زیادہ موزوں نظر آئی وہ کچھ یتیموں کی ملکیت تھی۔ یتیموں کا دل شوق سے مچل گیا کہ یہ خدائی اعزاز ان کے حصے میں آرہا ہے۔ انھوں نے کوئی قیمت لینے سے انکار کر دیا۔ لیکن یتیموں کے بہترین والی اور بیکسوں کے سب سے زیادہ غم خوار حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھلا یہ کب گوارا ہو سکتا تھا کہ معاوضہ دیے بغیر ان یتیموں کو ان کی اس ملکیت سے محروم کر دیا جائے۔ انھیں تو یہ فکر تھی کہ انسان کی جھولی میں دولت دو جہاں سمیٹ دیں۔ ادا شناس رسالت حضرت ابوبکرؓ نے اشارہ پاتے ہی اپنا سرمایۂ حیات حضورؐ کے قدموں پر لا ڈالا، اور مدینہ میں خدا کا گھر تعمیر ہو گیا۔ مکہ میں اپنا سب سے پہلا گھر تعمیر کرانے کا اعزاز خدا نے اپنے خلیلؑ کو بخشا تھا۔ مدینہ میں مسجد نبوی کی تعمیر کا شاندار موقع آیا تو خدا کی نظرِ انتخاب حضرت ابوبکر صدیقؓ پر پڑی۔ جن کے بارے میں خدا کے رسولؐ نے فرمایا تھا کہ خدا کے سوا اگر میں کسی کو اپنا دوست بناتا تو وہ ابوبکرؓ ہی ہوتے۔ اسی انسان کے خون پسینے کی کمائی اس قابل قرار پائی کہ اس نورانی عبادت گاہ کی بنیادوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سما جائے۔

اب حق و باطل کا معرکہ تیز و تند تلوار کی دھار بن چکا تھا۔ اب جنگ کی سرخ و سیاہ گھٹائیں ہر افق سے منڈلاتی ہوئی مدینہ کی طرف بڑھی آرہی تھیں۔ اب اللہ والوں کو زخم کھانا ہی نہیں ظالم کے سینے پر چرکہ لگانا بھی لازمی تھا۔ وہ مومن جو تیرہ سال سے صبر و سکوت کی قربان گاہ میں کھڑے ہوئے تھے اب ان کو غیرتِ بندگی کے بیقرار تقاضے خون کے دریاؤں اور تلواروں کی چھاؤں میں آجانے کی دعوت دے

رہے تھے لیکن سچ یہ ہے کہ حضورؐ جہاں بھی تشریف لے گئے یہ پروانۂ رسول کشاں کشاں ساتھ آیا۔ خوف وخطر کے اس مقام پر بھی دنیا نے یہی دیکھا کہ ساری دنیا سے دامن جھٹک کر چل دینے والا بے نیاز انسان یہاں بھی ٹھیک اسی ادائے جاں نثاری سے دامن مصطفےٰ کو بچوں کی طرح چمٹا ہوا ہے۔ جیسے ان کو زندگی کا وہ ایک لمحہ بھی دائمی موت سے زیادہ گراں تھا۔ جب ان کے اور محمدؐ کے درمیان ذرا سا بھی فاصلہ حائل ہو جائے۔

جب جنگ بدر کے ہمت آزما میدان میں پہلی بار اس حقیقت کا تاریخی فیصلہ ہونا تھا کہ اکیلا زبردست خدا کافی ہے یا پتھروں سے ڈھالے ہوئے سیکڑوں جھوٹے خدا؟ جب باطل کے پاس سوائے خدا کے سب کچھ تھا اور حق کے دامن میں رحمتِ خدا کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ جب بھوک اور افلاس سے کچلے ہوئے مٹھی بھر انسان خدا پر بھروسہ اور محمدؐ کا اعتبار کر کے وہاں تک کھنچ آئے تھے جہاں موت اور زندگی کی سرحدوں پر کفر و شرک کی ساری درندگی جبڑے پھیلائے کھڑی تھی۔ جہاں بھولے بھالے انسانوں کو کچا چبا جانے کے لیے شیطنت کا ایک جنگل کا جنگل دانت پیستا اور چنگھاڑتا ہوا آگے بڑھتا چلا آرہا تھا۔ جہاں صرف ایمان کی طاقت سے آہنی ہتھیاروں کو توڑ دینا اور آبدار تلواروں کو کند کر دینا تھا۔ جہاں دلوں کے سوز سے فولادی چٹانیں پگھلا دینی تھیں۔ جہاں بے سروسامانی کو ثابت کرنا تھا کہ وہ ساز و سامان پر بھاری ہے۔ جہاں انسان کو اپنا عجز اور اللہ کی کبریائی کا ثبوت ایک ساتھ پیش کرنا تھا۔ وہاں جہاں باطل کی دیو پیکر صفوں پر کفر و سرکشی نے شور و شر سے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا وہاں خیمۂ رسالت میں بندگی کا عجز آخری انتہاؤں کو چھو رہا تھا۔ یہاں خدا کی شانِ بے نیازی سے لرزہ براندام ہو کر جن و بشر کے آقا محمدؐ کبھی فرشِ خاک پر سر رکھتے تھے اور کبھی ایک بھکاری کی طرح خدا کے سامنے ہاتھ پھیلا کر بہ ہزار خشوع گڑگڑاتے اور غیرتِ خداوندی اور رحمت کو تڑپ تڑپ کر پکارتے تھے۔ اس وقت بھی وہ رازدان رسالت حضورؐ کے پہلو میں کھڑا ہوا شہادتِ حق کی ہوک سے تھرتھرا رہا تھا۔ جب عبد و معبود کے

درمیان ناز و نیاز کے اس عجیب و غریب عالم میں آں حضرتؐ کی تڑپ ان دعائیہ الفاظ تک پہنچی:

"یا اللہ! مجھے بے یار و مددگار نہ چھوڑ! مجھ سے تو نے جو وعدہ کیا ہے اس کو پورا فرما۔ اگر تیرے یہ مٹھی بھر بندے آج اس میدان میں کام آ گئے تو کیا اے خدا! ـــــ اے خدا! تو یہ چاہتا ہے کہ زمین پر کبھی تیری پرستش نہ ہو..... کیا....."

تو بے اختیار حضرت ابوبکرؓ کا کلیجہ منھ کو آ گیا۔ دل کی بیقرار دھڑکنیں ہونٹوں پر تڑپ گئیں اور ساری انسانیت کا سوزِ حق ـــــ سوزِ شہادتِ حق اپنی آواز میں سمیٹتے ہوئے انھوں نے آنسوؤں سے بھیگی اور جوش سے کانپتی ہوئی آواز میں سرگوشی کی "اللہ کا رسولؐ سچا ہے ـــــ سچ کہتا ہوں اللہ کا رسولؐ بالکل سچا ہے۔"

اُدھر جنگ تھی کہ شدت پکڑ رہی تھی۔ اِدھر دعائے رسولؐ کا دلدوز سوز تھا کہ جسم و جاں اور کون و مکاں سے آگے نکلا جا رہا تھا۔ اُدھر وحشیوں کی چنگھاڑ سے فضاؤں میں شگاف پڑ رہے تھے۔ ادھر روح و دل کی ہوک تھی کہ ذرّوں سے ستاروں تک کائنات کا دل ہلائے دے رہی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ ان دونوں کے درمیان تھے۔ ادھر فرض تھا جو خون کے ایک ایک قطرے کو گرمائے دے رہا تھا۔ ادھر رسولؐ کا درد دل تھا جو اُن کو تڑپائے دے رہا تھا۔ کہ حضورؐ کے قدموں پر اپنا دل چیر کر ـــ کلیجہ نکال کر رکھ دیں۔ فرطِ شوق سے ان کا وجود دو حصّے ہو جانا چاہتا تھا کہ ادھر بھی کام کر سکے اور اُدھر بھی کام آ سکے۔ محاذِ جنگ کی للکار سنائی دیتی تو بجلی کی طرح تڑپتے، بل کھاتے ہوئے نکل جاتے۔ پھر خیمۂ رسولؐ نظر آتا تو موت اور زندگی دونوں کو بھولے ہوئے ـــ آگ و خون کے طوفانوں کو چیرتے ہوئے، پارے کی طرح لرزتے تڑپتے ہوئے حضورؐ کے پاس دوڑ کر آتے اور پھر ایک نظر حضورؐ کو دیکھ کر شہادت کی نئی دھن میں محاذِ جنگ کی طرف جست کر کے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتے، اس عالم میں انھوں نے تلواروں

کی چھاؤں میں کھڑے ہو کر خیمۂ رسالتؐ کی طرف پلٹ کر دیکھا تو شدّتِ جذبات سے ایک بجلی سی گر گئی۔ ایک سنسنی خیز، رقت انگیز منظر نے ابوبکرؓ کی تمام توجہ کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ انھوں نے دیکھا کہ حضورؐ اب دعا میں اس قدر گم ہو چکے ہیں کہ آپؐ کو اور کسی بھی شے کا ہوش باقی نہیں ہے۔ ارتعاش و اضطراب کا عالم یہ تھا کہ آپؐ کی چادرِ مبارک شانوں سے کھسکتے کھسکتے زمین پر جا گری تھی اور آپؐ اسی طرح ہاتھ پھیلائے ہوئے معبودِ حقیقی کے آگے گڑگڑا رہے تھے۔ پیغمبرؐ کی یہ کیفیت کتنی دلدوز اور کیسی ہوش رُبا تھی کہ حضرت ابوبکرؓ بے اختیار خیمے کی طرف دوڑ رہے تھے۔ اشک بار۔ بیقرار۔ پروانہ وار! صرف اس لیے کہ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر زمین پر گر گئی تھی۔ ہائے ان مقدّس شانوں سے ڈھلک کر اس چادر کا زمین پر گر جانا ابوبکر صدیقؓ کے لیے زمین و آسمان کے گر جانے سے بھی کہیں زیادہ تھا۔ وہ مامتا سے بیقرار ماں کی طرح آئے اور اس حسین چادر کو اشک آلود آنکھوں سے لگا کر پھر انھیں شانوں پر درست کر دیا۔ جن شانوں پر دنیا بھر کی غم خواری کا بوجھ کوہ گراں کی طرح رکھا ہوا تھا۔

جب منافقوں کی انتہائی شریر ٹولی نے ابوبکرؓ کی چہیتی بیٹی زوجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور امت کی ماں حضرت عائشہ صدیقہؓ کے خلاف رسوائے زمانہ مہم چھیڑی تھی۔ جب ایمان و یقین سے روشن سینوں میں بدگمانی کا شیطانی خنجر بھونکا جا رہا تھا۔ جب ایک طرف نبیؐ کی روح کو دوسری طرف حضرت ابوبکرؓ کی شرافت کو گھائل کر دینے کے لیے وحشیانہ وار کیا گیا تھا۔ اس وقت بھی حضرت ابوبکرؓ نے اپنے جذبات کی طرف نہیں اُسوۂ رسولؐ کی طرف ہی دیکھا۔ انھوں نے دیکھا کہ حضورؐ انتہائی اضطراب کے باوجود کس شان صبر و سکوت کے ساتھ قدم اٹھا رہے ہیں تو وہ بھی سر جھکا کر اسی راہ پر ہو لیے۔ ایک چیخ بھی نہ نکلی۔ ایک گرم نظر بھی تو نہ اٹھائی۔ شدید اضطراب کی کرب ناکیاں اور پھر مکمل صبر و سکوت! چند قدم اس راہ پُرخار پر چلے تھے کہ زخمی دل پر ایک اور بجلی گری۔ پتہ چلا کہ اس لرزہ خیز فتنہ کا شکار کچھ سادہ دل مسلمان بھی ہو گئے

ہیں اور ان مسلمانوں میں وہ مسطحؓ بن اثاثہ بھی شامل ہیں جن کی عمر بھر کی کفالت پر حضرت ابوبکرؓ نے اپنی آغوش محبت کی بہترین گرم جوشیاں صرف کی تھیں خود اپنے پالے ہوئے کے ہاتھوں کو اپنی عزت و آبرو کے خون سے رنگین دیکھ کر ان پر جو بھی قیامت گذر گئی ہو کم ہے لیکن اس وقت بھی انھوں نے منھ سے کچھ نہ کہا۔ دل تھام کر اور کلیجہ مسوس کر رہ گئے۔ وہ اس وقت تک کچھ کہنے کے بجائے صرف سہنا چاہتے تھے۔ جب تک حقیقت خود واضح نہ ہو جائے وہ خوب جانتے تھے کہ یہ الزام ایک پاک دامن کی حرمت پر قاتلانہ حملہ ہے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ حضورؐ کی بے چینی اور فتنہ انگیز منافقوں کی فتنہ طرازیوں کے درمیان حضرت عائشہؓ کے ڈھانچے لگے جا رہے تھے۔ جو آنسوؤں سے تر بتر تکیے پر سر ڈالے ہوئے کانٹوں اور شعلوں کی سیج پر تڑپ رہی تھیں لیکن کوئی شئے صدیقی صبر کا پیمانہ نہ چھلکا سکی۔ وہ سینے پر صبر کی سل رکھے ہوئے اور ہونٹوں پر تقویٰ کے قفل چڑھائے ہوئے صرف اس لیے خاموش تھے کہ یہ خاموشی اسوۂ رسولؐ تھی — یہ رضائے الٰہی کا دل کش تقاضا تھا۔ یہ ادا ان کے جذبات پر کتنی ہی گراں کیوں نہ ہو ان کو دل و جان سے زیادہ پیاری تھی کہ یہ ان کے مولا کو پیاری ہے۔ آخر صبر کی جاں گدازیاں اپنے نیک انجام کو پہنچیں۔ انتظار کے پہاڑ سے دن کٹ ہی گئے اور آسمانی آواز نے اعلان کیا کہ زمین پر یہ فتنہ سراسر جھوٹ بہتان ہے۔ حضرت ابوبکرؓ اس وقت بولے جب خدا خود بول اٹھا تھا۔ اخلاق و شائستگی کی حدوں میں رہتے ہوئے انھوں نے اس وقت بھی اس سے زیادہ احتجاج نہ کیا کہ "خدا کی قسم! اس فتنہ پردازی کے بعد میں مسطحؓ بن اثاثہ کی پرورش نہیں کر سکتا۔" یہ ایک حلیم ترین بندۂ مومن کے الفاظ تھے جہاں سادہ و سنجیدہ الفاظ کی تہہ میں زخمی جذبات کے طوفان دبے ہوئے تھے۔ لیکن ابھی اس فیصلہ کن اعلان کی گونج بھی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ خدا کی دوسری آواز نے حضرت ابوبکرؓ کو کھوئے ہوئے جذبات سے چونکا دیا:

"تم میں سے بڑے اور باحیثیت لوگ عزیز و اقرباء، مسکینوں، اور

راہ خدا میں گھر بار چھوڑ دینے والوں کو (مدد) نہ دینے کی قسم نہ کھائیں اور چاہیئے کہ ان کے قصور معاف کریں اور درگذر کریں۔ کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ اللہ تم کو بخش دے؟ اور اللہ انتہائی معاف کرنے والا اور ترس کھانے والا ہے۔"

خدا کی یہ آواز سنتے ہی حضرت ابوبکرؓ نے اپنی آواز دبا دی ـــــ اپنے زبردست جذبات کا گلا گھونٹ دیا۔ یہ الفاظ کہ "کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ اللہ تم کو بخش دے؟" حضرت ابوبکر صدیقؓ کی روح کو تڑپا دینے والا سوال تھا۔ غیرت و خودداری کے جذبات عجز و بندگی میں ڈھل گئے۔ دل و جگر کا گرم خون آنسوؤں میں تبدیل ہو گیا۔ خدا کا پرستار خدا کے قدموں پر گرتے ہوئے گڑگڑا رہا تھا۔ "ہاں میرے مولا میں یہ چاہتا ہوں ـــــ میں یہ چاہتا ہوں کہ تو مجھے بخش دے۔" سجدے سے سر اُٹھایا اور اعلان کیا "خدا کی قسم! اب بھی ہمیشہ مسطحؓ کا کفیل رہوں گا۔ ہمیشہ ہمیشہ۔"

غزوۂ تبوک کی تیاریوں میں جب ہر مومن مالی و جانی حصہ لینے کے شوق میں اپنی بساط سے آگے نکلا جا رہا تھا۔ جب حضرت عمرؓ نے نصف گھر بار اُٹھا کر راہ مولا میں لٹاتے ہوئے سوچا تھا کہ شاید نیکی کی دوڑ میں آج میں صدیق اکبرؓ پر بازی لے جا سکوں گا ـــــ اس وقت حضرت ابوبکرؓ ایک کونے میں غلام و مسکین کی طرح یوں سمٹے بیٹھے تھے جیسے بہت کچھ کر گذرنے کی زبردست تڑپ ہو مگر عملاً تڑپ کا حق ادا نہ ہو سکا ہو۔ اس عالم میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ "آج وہ خدا اور رسول کے لیے کیا لائے ہیں؟" تو انکساری میں ڈوبا ہوا یہ جواب ملا۔ "جو کچھ تھا وہ سب کچھ لے آیا ہوں۔" یہ جواب اور پھر یہ ادائے عاجزانہ ـــــ حاضرین سناٹے میں آ گئے۔ خدا کے رسولؐ فرطِ شفقت سے پکار اٹھے۔ "اور گھر والوں کے لیے آخر کیا چھوڑ کر آئے ہو؟" ـــــ "خدا اور خدا کا رسولؐ!" محبت اور عقیدت میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔

ہاں ـــ اے گردشِ تقدیر! کبھی ہماری سب سے قیمتی دولت کا نام

"خدا اور رسولؐ" ہی تھا۔ کسی اور کا رونا تو کیا، سچ یہ ہے کہ ہمیں اب خود بھی یہ یقین کرنا دشوار ہے کہ کیا سچ مچ ہم اب بھی ٹھیک وہی ہیں جو کبھی تھے؟ کبھی ہمارا یہ حال تھا کہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی یہ محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کچھ بھی نہیں ہو سکا۔ اب کچھ نہ کر سکنے کے باوجود ہم اس طرح مطمئن ہیں جیسے بندگی کے سارے حقوق ادا کر چکے ہوں۔ ہاں خدا کا شکر ہے کہ ہمیں اپنی اس "دیوانگی" کا دکھ بھرا احساس ہے اور بس یہی وہ احساس ہے جس کے دم تک ہمارا ایمان زندہ ہے لیکن کیا یہ ایمان کی جاں بہ لب طاقت زندگی اور موت کا پل صراط طے کرنے کے لیے کافی ہے؟ — کیا یہ فکر ہمیں ستاتی ہے کہ —

"کیا ہم مُسلمان ہیں؟"

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

اسلام دل سے نہیں نکل سکتا

وہ بھی کیسا جاں نواز وقت رہا ہوگا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی درد بھری دعا کی صدائے بازگشت بنے ہوئے حضرت عمر ابن خطابؓ کفر کی تاریک وادی سے اسلام کے نورانی شہر کی طرف پیش قدمی کر رہے تھے مگر خود انھیں بھی اس کی خبر نہ تھی کہ آج دارارقم کی دیواریں ان کے نعرۂ توحید سے گونج اُٹھنے کے لیے کیسی بے قرار و منتظر ہیں! ۔ انھیں کیا گمان ہوسکتا تھا کہ پیغمبر اسلامؐ کے خلاف جو تلوار انھوں نے انتہائی خوفناک ارادے سے بے نیام کی ہے وہ خود ان کے اپنے کفر پر بجلی بن کر گر جانے والی ہے! ۔ وہ نہ جانتے تھے کہ ان کے صاحب ایمان بہنوئی اور بہن کے چہرے جب عمرؓ کے وحشیانہ تھپیڑوں سے خون آلود ہو جائیں گے تو ان کے اس مقدس خون کی چند چھینٹیں ان کے دل کی ایک ایک دھڑکن پر یہ عظیم اعلان ثبت کر دیں گی ۔

"اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اس کے رسول ہیں۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خدا سے کفر کی جتھ بندی توڑ دینے کے لیے یہ دعا مانگی تھی کہ "اے قادرِ مطلق! ابوجہل بن ہشام اور عمر ابن خطاب میں سے کسی ایک کو ہمیں دے دے!

آج عمر اگرچہ اس ارادے سے اُدھر آنکلے تھے کہ فرصت کے لمحوں میں کچھ دیر حق کے اس پیغام کے ساتھ چھیڑ خانی کا لطف اٹھایا جائے ـــ مگر ان کی رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کو ـــ ان کے پہاڑ جیسے ارادے کو ـــ ان کے ضمیر کی تہہ میں بھڑکنے والی حقیقت کی تلاش کو ـــ قدم قدم پر ـــ بار بار "حق" پکارتا آرہا تھا اور ـــ عمرؓ اس پکار کو سنتے ہوئے ـــ اپنی مخصوص شان پختگی کو قائم رکھتے ہوئے اندر ہی اندر ـــ آہستہ آہستہ ـــ قطعی غیر محسوس طور پر کفر کی طرف اپنی پشت

اور اسلام کی جانب اپنا رُخ تبدیل کرتے آرہے تھے ـــــ خدائے نادیدہ، خدائے واحد کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے ہوئے رسولؐ کے پاک لبوں سے جو زندگی سے بھرپور اور پُرکیف آواز آرہی تھی اس نے تو جیسے آج عمرؓ کے پورے وجود کو سکتے میں ڈال دیا تھا! عمرؓ کھڑے کے کھڑے رہ گئے! ـــــ اس وقت وہ سورۂ الحاقّہ کی عظیم آیات کو محمدؐ کی آواز میں سن رہے تھے ـــــ جن میں کبھی زمین کی دو غارت شدہ قوموں عاد و ثمود کے کھنڈر ابھرتے تھے اور کبھی قیامت کے زلزلے کی گرج صاف سنائی دیتی تھی ـــــ کبھی یہ منظر آنکھوں کے سامنے لایا جارہا تھا کہ قبروں کے دہانوں سے مُردوں کے دَل کے دَل اُمنڈتے ہوئے میدانِ حشر کی بیکراں وسعتوں میں پھیلتے جارہے ہیں تو کچھ چہرے سیاہ پڑ گئے ہیں اور کچھ پھولوں کی طرح مسکرا اُٹھے ہیں ـــــ یہ کارواں آگے بڑھ رہا ہے اور اس ترازو کے گرد جمع ہو رہا ہے جہاں نیکی اور بدی کے دو پلڑوں میں پوری پوری زندگیوں کو تول تول کر یہ بتایا جائے گا کہ کون خدا کی جنت کا مستحق ٹھہرا اور کون دوزخ کا ذلیل ایندھن قرار پایا؟ ـــــ اور پھر کس طرح ستر ستر گز کی بھاری بھرکم زنجیروں کی ایک زبردست جھنکار ہوگی اور یہ ہولناک منظر سامنے ہوگا کہ خدا کی فرض شناس پولس نے مجرموں کے شکنجے کس ڈالے اور اب انھیں اہلِ جنت کے پُرمسرت تبسّم سے بہت دُور اس دوزخ کی طرف ہنکا دیا گیا جو دُور ہی سے تیوری چڑھائے چیختا دہاڑتا سنائی دے رہا ہے۔

عمر ابن خطابؓ نے یہ آوازِ حق سُنی اور انھیں صاف محسوس ہوا کہ یہ آواز اب باہر نہیں خود ان کے اپنے سینے کے اندر ہلچل ڈال رہی ہے ـــــ مگر ابھی تک دل جاگا نہ تھا ـــــ سب کچھ سمجھ کر بھی کچھ سمجھ میں نہ آسکا۔

"کیسی عجیب و غریب آواز!!" دل ہی دل میں وہ بڑبڑائے اور پھر ـــــ خود ہی زیادہ سے زیادہ محض یہ نتیجہ نکال سکے۔ "یقیناً یہ شخص تو کوئی بڑا ہی زبردست شاعر ہے.....!" ـــــ لیکن یہ آواز ابھی ان کے سینے سے اٹھی ہی تھی کہ وہ یہ محسوس کر کے سکتے میں آگئے کہ قرآن نے ان کی یہ خفیہ آواز بھی سن لی ہے اور نہ صرف سن لی ہے

بلکہ اگلی آیات میں اس کا دو ٹوک جواب بھی دیا جا رہا ہے!

"وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ! ـــــ نہیں، یہ کسی شاعر کی بات نہیں ـــ مگر تم بہت کم ایمان لاتے ہو!"

"ارے!" عمرؓ کے دل کی سرگوشی بے ساختہ حرف تعجب میں ڈھل گئی۔ "کتنا بڑا کاہن ہے!!"

وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ـــــ قرآن نے فی الفور اس خیال کو بھی مسترد کرتے ہوئے کہا "یہ کسی کاہن کا بھی قول نہیں ہے ـــ تم تو بہت ہی کم سمجھتے ہو!"

عمر ابن خطابؓ کی دنیائے خیال میں یکایک ایک سناٹا چھا گیا اور اس زبردست سناٹے میں قرآن کی آواز آئے چلی جا رہی تھی۔

"یہ (کلام) اُتارا ہوا ہے رب العٰلمین کا، اور اگر یہ (پیغمبر) گڑھ لاتا ہم پر کوئی بات تو ہم پکڑ لیتے اس کا داہنا ہاتھ، پھر کاٹ ڈالتے اس کی گردن ـــ پھر تم میں کوئی ایسا نہیں جو اس سے (خدا سے) بچا سکے اور یہ نصیحت ہے ڈرنے والوں کے لیے ـــ اور ہم جانتے ہیں کہ تم میں سے بعضوں کا شیوہ جھٹلانا ہے مگر یہ شیوہ اندوہ و حسرت کے سوا کچھ بھی دینے والا نہیں۔"

انھوں نے یہ سب کچھ سنا ـــ روح یقیناً ہل گئی تھی مگر تاثرات کا یہ زلزلہ ابھی لاشعور کی تہہ سے ابھر کر شعور کی سطح تک نہ پہنچا تھا۔ اس لیے سچائی کے یہ حسین جھٹکے پے بہ پے لگائے جا رہے تھے ادھر حق تھا کہ اندر ہی اندر ان کے دل کے لطیف تاروں کو چھیڑ چکا تھا مگر شعور تھا کہ ماحول کے حق دشمن شور و غل میں پستا ہوا خود اپنی روح کی موسیقی سن ہی نہیں سکتا تھا۔ ایک زبردست کش مکش اندر اور باہر برپا تھی جس نے ایک زبردست جھنجھلاہٹ اور غصّے کی شکل اختیار کر لی۔

آخر اس ذہنی کش مکش کا دو ٹوک فیصلہ کرنے کے لیے انھوں نے ابھی تلوار کو میان سے باہر نکالا اور اس ہستی کو قتل کر ڈالنے کے ارادے سے نکل کھڑے ہوئے

جس کے ایک قطرۂ خون کی قیمت آسمان کے سارے مہ و انجم بھی نہیں ہو سکتے تھے ـــــ یہ وہ لمحہ تھا جب غیر محسوس حق اور محسوس باطل ان کے اندر پوری قوت سے گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ جذبات کی یہ پُرشور آندھی چلی، مکّے کے گلی کوچوں میں داخل ہوئی کہ اچانک اس آندھی سے ایک انسان آٹکرایا۔ یہ حضرت نعیم بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ وہ عمرؓ کے خوف ناک تیور دیکھ کر ٹھٹک گئے۔

"کدھر؟ ـــ اے عمر کدھر؟" انھوں نے آگے بڑھ کر گہری تشویش کے ساتھ پوچھا ـــ "محمّد (صلے اللہ علیہ وسلم) کا فیصلہ کرنے چلا ہوں۔" عمرؓ کی سُرخ سُرخ آنکھوں سے شعلے سے نکلے اور ابن عبداللہ نے ان کی آواز میں بادل جیسی کڑک محسوس کی۔

"پہلے اپنے گھر کی خبر لو۔" ابن عبداللہؓ نے پوری بے جگری کے ساتھ اس شخص کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں جس کے ہاتھ میں ننگی تلوار تھی اور سر پر خون سوار تھا۔ جس حق کا فیصلہ کرنے کے لیے تم اس طرح گھر سے نکلے ہو وہ حق خود تمھارے گھر میں گھس کر تمھاری بہن بہنوئی کے سینوں میں اُتر چکا ہے۔"

یہ بات سنتے ہی عمر ابن خطاب تلملا گئے ـــــ سرعت سے گھومے اور بارگاہِ رسالت کے بجائے اپنی بہن کے مکان کی طرف طوفانی رفتار سے چل پڑے۔

دروازے پر قدم رکھتے ہی انھوں نے سنا کہ اندر قرآن پڑھا جا رہا ہے۔ یہی وہ وقت تھا جب ان کی بہن اور بہنوئی حضرت خباب ابن ارتؓ سے اللہ کی کتاب کی تعلیم حاصل کیا کرتے تھے۔ آج عمر قرآن پر کچھ غور کرنے کے قابل نہ تھے ـــــ آج تو قرآن کی آواز سنتے ہی ان کے غیظ و غضب کا لاوا کھول اٹھا تھا۔ انھوں نے دروازے کو خوفناک جھٹکوں سے جھنجھوڑ ڈالا ـــــ دروازہ کھلا اور وہ اندر داخل ہوئے مگر انھوں نے دیکھا کہ وہ کتاب چھپا دی گئی ہے اور ہر طرح کے غیظ و غضب کا نشانہ بننے کے لیے ایک مومن اور مومنہ نے پوری جرأت سے سینہ کھول دیا ہے۔

"یہ کیسی آواز تھی؟" بہن اور بہنوئی کو آنکھوں ہی آنکھوں میں کھا جانے کے انداز میں گھورتے ہوئے انھوں نے پوری قوت سے للکارا۔

"کیسی آواز؟" مومن اور مومنہ دونوں نے انتہائی بے نیازی کے ساتھ کہا ـــــ ان کو مکمل اطمینان تھا کہ وہ اپنے خدا کی کتاب اور اپنے معلّم صحابی رسولؐ کو اس غضب ناک طوفان سے بہت دور پہنچا چکے ہیں اور اب جو کچھ ابتلا پڑنی ہے وہ خود ان کے اپنے جسموں پر ہی پڑنی ہے ـــــ وہ جسم جن کا رواں رواں خدا کے ہاتھ بک چکا ـــــ وہ جسم جن کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ خود اپنے لہو میں نہا دھو کر وہ ہمیشہ کے لیے زندہ اور پاک و صاف ہو جائیں۔

"بس کرو!" عمر ابن خطاب زمین پر پاؤں پٹختے ہوئے گرجے۔ "میں خوب سمجھ چکا ہوں کہ تم دونوں مرتد ہو گئے ہو!"

یہ کہا اور پھر جواب کا انتظار کرنے کی بھی ان کے غیظ نے اجازت نہ دی، بھوکے شیر کی طرح وہ بہنوئی پر جھپٹے تو بے رحم ہاتھوں کی بھرپور ضرب پڑتے ہی وہاں آہ اور کراہ کے بجائے توحید و رسالت کی گواہی کی آواز بلند ہوئی۔ پھر فوراً ہی ایک بجلی سی چمکی اور عمر ابن خطاب نے دیکھا کہ مومنہ بیوی اپنے مومن شوہر کو بچانے کے لیے ڈھال بن کر آگے آ گئی ہے، ٹھیک اس وقت جب دو قوی ہاتھوں کے پے در پے وار ایک مرد مومن کو نڈھال کرنے کے بعد ایک مومنہ کے معصوم چہرے پر اپنی قوت آزما رہے تھے ـــــ بہن کے ہونٹوں ـــــ خون آلود ہونٹوں پر غیرتِ ایمانی کی زلزلہ انگیز گرج ابھری اور عمر نے سکتے کے عالم میں یہ محسوس کیا کہ یہ آواز اپنی پوری گرج اور دھماکے کے ساتھ ان کے دست و بازو کی تمام فولادی قوتوں کو پاش پاش کرتی ہوئی ان کے وجود کے اندر گھس آئی ہے۔ ایک زبردست تھرتھری پیدا ہوئی اور ان کے قلب و روح کی بنیادیں لرزتی چلی گئیں۔

"اے عمر!" جسمانی محاذ پر نڈھال ہو کر گرتی ہوئی بہن نے ایمان کے روشن افق سے ابھرتے ہوئے کہا "اے عمر! ـــــ جو بن آئے کر گزرو۔ لیکن اب اسلام اس دل سے نہیں نکل سکتا!"

کیا یہ محض ایک آواز تھی؟ یہ تو ایمان و یقین کا ایک زلزلہ تھا۔ یہ تو حق پر جاں نثاری

کا کوہ افگن ولولہ تھا ـــــ یہ حقیقت کی پرجلال کڑک تھی ـــــ کیسے ممکن تھا کہ اس آواز کے آگے وہ انسان بے حس و حرکت پتھر بنا رہتا جس کے سینے میں ایمانی حرارت نے بھٹیاں سلگا دی تھیں ـــــ یہ آواز سنتے ہی عمر ابن خطاب کھڑے کے کھڑے رہ گئے ـــــ شرم اور کرب کے ملے جلے جذبات میں سر جھک گیا۔ پھر نظر اٹھی اور بہن کے چہرے کو جسم کے خون اور ایمان کے جلال سے سرخ دیکھ کر بے اختیار آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ آنسوؤں کا یہ ابال بتا رہا تھا کہ سینے کی تمام چٹانیں پگھل رہی ہیں۔

"میری بہن ـــــ فاطمہ!" درد بھری آواز میں عمر ابن خطاب پکار اٹھے۔ "مجھے بھی تو وہ چیز دکھاؤ جس کو تم لوگ پڑھ رہے تھے....."

بھائی کی زندگی میں حیات انگیز انقلاب کی یہ سنہری پو پھٹتے ہوئے دیکھ کر بہن اور بہنوئی دونوں بھول گئے کہ ابھی ابھی ان کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا ہے، وہ بے تابانہ اٹھے ـــــ بہن نے اپنے بھائی کو غسل کے وہ آداب سکھائے جو اس مقدس کتاب کو چھونے سے پہلے ضروری تھے ـــــ اور پھر وہ کتاب کے اجزا بھی ان کے سامنے لا کر کھول دیئے۔ جس کے اندر سے خدا کی آواز آ رہی تھی۔

"زمین و آسمان میں جو کچھ ہے وہ سب کا سب خدا کی پاکی بیان کرتا ہے خدا زبردست ہے ـــــ وہ حکیم ہے۔"

اُدھر زخمی بہن اور بہنوئی کی آنکھوں میں مسرت کی شدت آنسو بن کر اُبل پڑی تھی۔ یہ دیکھ کر کہ ان کے بھائی کفر و شرک کی دَل دَل سے نکل کر قبولِ حق کی سمت ملحہ بہ ملحہ آگے بڑھتے آ رہے ہیں اور ادھر عمر ابن خطاب کے سینے میں حق کی پہچان کا بے پناہ جذبہ پیوست ہوتا جا رہا تھا۔ قرآن کے ایک ایک حرف میں ان کو اپنے دل کی دھڑکن سنائی دے رہی تھی اور دل کی دھڑکنوں کی یہ چوٹ ان کی آنکھوں کو آنسوؤں سے لبریز کر چکی تھی، جب اس کیفیت میں وہ یہاں تک پہنچے کہ:

"لاؤ ایمان اللہ اور اس کے رسول پر۔"

تو بے ساختہ پکار اٹھے: اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ

مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ۔

"میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔"

اور اب ——

اپنے قلب و نظر کے میناروں پر سچائی کے دیئے جلائے —— عمر ابن خطّاب حضرت عمر ابن خطّاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عظیم الشان شخصیت میں ڈھلتے ہوئے ایک بار پھر اسی کوچۂ رسالت کی طرف روانہ ہوئے جدھر تھوڑی دیر ہوئی وہ دنیا کا سب سے بڑا جرم کرنے نکلے تھے —— وہ تلوار اب بھی ہاتھ میں تھی مگر تلوار اٹھانے والا خود ہی ہلاک ہو گیا تھا۔ اب اس تلوار کا رُخ اسلام کی طرف نہیں کفر کی طرف تھا۔ اب رگوں میں دوڑتا ہوا خون بے قرار تھا کہ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاکِ پا کے ایک ایک ذرّے کو رنگین کر دے۔ دارِ ارقم پر جب ان کی دستک سنی گئی اور دیکھنے والوں نے یہ دیکھا کہ عمرؓ ننگی تلوار لیے آ رہے ہیں تو مسلمانوں کو قدرتاً خطرے کا احساس ہوا اور اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے حضرت امیر حمزہؓ نے للکار سنائی:

"آتا ہے تو آنے دو —— اگر کسی بُری نیت سے آ رہا ہے تو خود اس کی تلوار سے اس کا فیصلہ کر دوں گا۔"

مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک عجیب مسرّت بھری کیفیت میں اُٹھے —— سب کو روکا اور خود آگے بڑھ کر حضرت عمرؓ کے دامن کو جھٹکا دیتے ہوئے فرمایا۔ "کہو عمر؟ —— کس ارادے سے آئے ہو؟"

غلامانہ عجز و انکسار میں ڈوبی ہوئی آواز حضرت عمرؓ کے ہونٹوں سے بلند ہوئی۔

"ایمان لانے کے لیے۔"

حق کی اس عظیم الشان فتح پر بے اختیار رسول خداؐ اور اصحابؓ رسولؐ کے منہ سے نعرۂ تکبیر بلند ہوا۔

"اللہ اکبر!"

"اللہ اکبر" کا یہ فلک شگاف نعرہ وادی وادی ـــــ پربت پربت گونجتا لہراتا چلا گیا۔

یہ نعرہ ظفر و کامیابی کا وہ انقلابی موڑ تھا جہاں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام کی آغوش میں داخل ہوئے اس نعرے کو سن کر شیاطین میں صفِ ماتم بچھ رہی تھی۔ کفر و شرک کے گھروں میں کہرام برپا ہو گیا تھا۔ آگ اور خون کھولتے ہوئے کفر و شرک کے درندہ صفت انسان حضرت عمرؓ کے مکان پر چڑھ دوڑے۔ اس مظاہرے میں غیظ و غضب تھا۔ نفرت و حقارت تھی..... جوش انتقام تھا ـــــ درندگی اور وحشت کے کڑے تیور تھے اور ان سب کے پس منظر میں دلوں کے اندر چٹکیاں لیتا ہوا یہ احساس شکست تھا کہ کفر کی بہترین تلوار اسلام پر گرتے گرتے خود کفر کے سر پر بجلی بن کر گر گئی! ـــــ کفار و مشرکین کے جذبۂ انتقام سے بچانے کے لیے حضرت عمرؓ کے ماموں نے اعلان کیا کہ "عمرؓ ان کی پناہ میں ہیں"، مگر تلوار کی طرح کاٹتی ہوئی سیکڑوں نظروں پر نفرت و حقارت کی نگاہ ڈالتے ہوئے حضرت عمرؓ نے اعلان کیا کہ وہ اس پناہ سے خود کو نکالتے ہیں اور بڑے سے بڑے خطرات کو محض خدا کے بھروسے پر پوری قوت سے للکارتے ہیں۔

اور سچ مچ وہ چھ سال تک ان خطرات سے بے محابا ٹکراتے رہے ـــــ ظلم و سفاکی کی تمام شیطانی قوتوں کو للکارتے رہے ـــــ اور ٹھیک اس دور میں جب کہ کفر و شرک کی قہرمانی طاقت اس بات کی قسم کھا رہی تھی کہ اہل ایمان کو ان کے گھروں میں بھی خدا کا نام نہ لینے دیں گے۔ حضرت عمرؓ نے تین سو ساٹھ بتوں پر اس طرح ٹھوکر ماری کہ اہل ایمان کے ساتھ خانۂ خدا میں گھس کر نماز پڑھی ـــــ ظلم و ستم اور درندگی و بربریت کے جنگل میں پانچ چھ سال کا عرصۂ طویل بسر کرنے کے بعد جب انھوں نے خدا کی راہ میں وطن کو قربان کر کے ہجرت کا قصد کیا اور حضورؐ نے ان کو اس کی اجازت دے دی تو انھوں نے اعلان کیا:

"میں اس کفر و شرک کی دنیا سے دور جا رہا ہوں ـــــ جس کسی کا جی چاہے

وہ میرا تعاقب کرے اور میری تلوار کا ذائقہ چکھ لے!"

لیکن بھری بستی میں سے کوئی مقابلہ پر نہیں آسکا ـــ کیسے آسکتا تھا کوئی؟

جب مخبرِ صادقؐ کا کہنا تھا کہ "اے عمرؓ! تم سے شیطان بھی ڈرتا ہے!"

ہاں! تاریخ اس انسان کو کبھی نہیں بھول سکتی جس سے شیطان خوف کھاتا تھا تاریخ جانتی ہے کہ یہ ہستی وہ ہستی تھی جس کے سینے میں پیغمبرِ خدا کی دعا کے سوز سے خدا نے ایمان کی جوت جلائی تھی، مگر یہ بات کم ہی اُبھر کر سامنے آتی ہے کہ پیغمبرؐ کی اس دعا کی عملی تشکیل کے لیے خدا نے اسبابِ ظاہر کی دنیا میں جس ہستی کا انتخاب کیا وہ ایک عورت تھی! ـــ ایک کمزور عورت جس نے درد و کرب کی یورش میں پستے ہوئے کہا تھا:

"اے عمر! جو بن آئے کر گزرو ـــ! اب اسلام اس دل سے نہیں نکل سکتا۔"

نہ جانے کیسے ہوتے تھے وہ "دل" جن میں ایک بار اسلام داخل ہو جاتا تھا تو پھر کبھی نہیں نکلتا تھا ـــ اور نہ جانے کیا چیز تھا وہ اسلام و ایمان کہ اس کی ایک ہی آواز کفر کے مقفل تالوں کے فولادی پٹ کھول دیتی تھی ـــ جس کی ہوک سے وہ انسان عرفانِ حق کا عظیم داعیہ حاصل کرتے تھے کہ جن کے ایمان کے جلال سے شیطان بھی پتّے کی طرح کانپتا تھا۔

اور اب ـــ آہ اب ہمارے پاس نہ وہ سینے رہے اور نہ وہ اسلام و ایمان ـــ اب تو ہم اسلام کی آواز بلند کرتے ہیں تو خود ہماری زندگی بھی اس کا کوئی اثر نہیں لیتی ـــ ہمارا اپنا جمود کبھی لٹس سے مس نہیں ہوتا۔

خدارا! ـــ کوئی بتاؤ کیا یہ دونوں اسلام ایک ہیں؟ ـــ ایک ہو سکتے ہیں؟ روح اس تصور ہی سے لرز اٹھتی ہے کہ کیا..... ہم..... بھی..... مسلمان ہیں؟ ـــ کیا..... ہم..... بھی اس قابل ہیں کہ خدا کی اس زمین پر کھڑے ہو کر سر اٹھا کر یہ کہہ سکیں کہ ہاں ہم مسلمان ہیں! ـــ جب یہاں یہ عالم ہے تو پھر ـــ وہاں کیا حال ہوگا جہاں سب کچھ دیکھنے اور جاننے والا خدا ہمارے بارے

میں فیصلہ کر رہا ہوگا۔ "فیالیتنا فیا حسرتا"۔

"ایمان" ـــــ جمال و جلال کا دو آتشہ

خدا کی قسم! خدا کی قسم!! میں اس شخص کا سر اُڑا دوں گا جو یہ کہے گا کہ میرا محبوب آقاؐ اس دنیا سے چلا گیا ہے۔

وفات رسولؐ کے جاں کاہ اور ہوش رُبا حادثے پر حضرت عمر فاروق رضؓ کی عجیب حالت تھی۔ زندگی بھر وہ جس انسان کاملؐ کو دنیا جہان کی ہر شئے اور خود اپنی جان سے بھی زیادہ چاہتے رہے تھے اس ہستی کا اس دنیا سے اُٹھ جانا کتنی بڑی چوٹ تھی۔ عشق رسولؐ سے جو دل چور چور تھا یکایک چکنا چور ہو گیا تھا اور ہوش و حواس ایک زبردست خوں چکاں جنوں کے سامنے سے ہٹ کر نہ جانے کہاں گم ہو گئے تھے۔ لاکھوں ٹوٹے ہوئے دلوں، سسکتے ہوئے سینوں، اشک بار آنکھوں اور لرزتے ہوئے خشک ہونٹوں کے درمیان سے خدا کے آخری رسولؐ اپنے خدا کے پاس تشریف لے جا چکے تھے مگر یہ ایک ایسی فلک شگاف حقیقت تھی جس کو سہنا تو دور کی بات ہے اس کو سننے کی تاب و تواں بھی حضرت عمرؓ کھو چکے تھے ـــــ وہ دیوانوں کی طرح مسجد نبوی میں ادھیڑ بن اُدھر ٹہل رہے تھے ـــــ ننگی تلوار کے دستے پر ہاتھوں کی فولادی گرفت میں تشنج کی کیفیت پیدا ہو رہی تھی اور جذب و جنون کی یہ للکار ان کے ہونٹوں پر رہ رہ کر تڑپ اُٹھتی تھی۔

"خدا کی قسم! ـــــ میں اس شخص کا سر قلم کر دوں گا جس نے یہ کہا کہ محمدؐ اس دنیا سے کوچ کر گئے .....

خدا کی قسم! .....

توحید و رسالت پر جان سے فدا ہونے والا کیسا قابل رشک بندۂ مومن

تھا یہ شخص!! ـــــ یہ کہاں سے چلا تھا اور ـــــ کہاں جا پہنچا!! حق سے بے خبری کے دَور میں ایک دن ایسا بھی آیا تھا جب یہی انسان تلوار سونتے محمدؐ کو شہید کر دینے کی قسم کھاتا ہوا نکلا تھا لیکن جوں ہی قرآن کے افق سے ابلتی ہوئی روشنی کو دیکھ کر اس نے روح و دل کی محرابوں پر ایمان و عرفان کا چراغاں کیا۔ بس اسی لمحہ اس نے اپنی اسلام سے پہلے کی ساری زندگی پر وہی تلوار بے دریغ چلا دی۔ پھر جنگ بدر کے صبر آزما محاذ پر اس کی یہ تلوار بجلی بن کر چمکی اور ایمان کے مقابلے میں نسل و خون کے تمام رشتوں کو للکارتی چلی گئی۔ اس کا اپنا ماموں عاص بن ہشام بھی خدا اور رسولؐ کے خلاف ہتھیار اٹھانے کی جسارت بے جا کرنے کے بعد اس کی غیرتِ حق کی ننگی تلوار کے آگے اپنی جان سلامت نہ لے جا سکا! جن ہاتھوں نے خدا کے خلاف ہتھیار اٹھائے تھے وہ ہاتھ اس نے قلم کر دیئے اور جس سر نے خدا کی عظمت کے آگے جھکنے سے انکار کیا تھا اس کو خاک و خون میں ہمیشہ کے لیے سرنگوں کر دیا۔ پھر خون و ایمان اور جسم و جان کے درمیان جہاد و عزیمت کی عظیم گھاٹیاں طے کرنے کے بعد اس نے اسلامی پرچم کے قدموں میں بڑے بڑے مکی کافروں کو جنگی قیدیوں کی شکل میں پڑا ہوا دیکھا تو وہ بے ساختہ پکار اٹھا:

"ان لوگوں کی جاں بخشی نہ کی جائے جو جان آفریں کے ذلیل باغی ہیں۔ یہ سب کے سب گردن زدنی ہیں ـــــ آؤ ہم میں سے ہر شخص آگے بڑھے اور یہ بتائے کہ یہ خدا کے نہیں تو ہمارے بھی کچھ نہیں ـــــ آؤ ہم میں سے ہر شخص ان میں سے اپنے اپنے قریبی عزیزوں کو اپنے ہاتھ سے ذبح کر کے خدا کے قدموں میں ڈال دے ....."

ـــــ پھر غزوۂ اُحد میں یہی تلوار چمکی ـــــ آہن و فولاد کا جگر چیرتی ہوئی تلوار ـــــ باطل کی سنگلاخ چٹانوں کو ریزہ ریزہ کرتی ہوئی تلوار ـــــ لیکن جیسے ہی محمدؐ کی شہادت کی جھوٹی خبر میدان کارزار میں اس کو سنائی دی اُس کے بازو یکایک شل ہو گئے اور اس کی چٹانی ہمت موم کی طرح پگھلتی چلی گئی ـــــ لیکن یہ سنتے ہی کہ محمدؐ ہمارے درمیان زندہ سلامت ہیں وہ شیر نر کی طرح اٹھا اور اس وقت

بھی غیرت حق کی گرج سے باطل کا سینہ دہلاتا رہا۔ جب فتح یاب اسلام کچھ لوگوں کی لغزش کی بنیاد پر شکست کے خون آلود معنی سمجھا رہا تھا ـــــ جب پہاڑ کی چوٹی پر زخموں سے چور چور مومن پیغمبر اسلامؐ کے مقدس چہرے کو خون سے شرابور دیکھ کر تڑپ رہے تھے اور اپنے گھائل ہاتھوں سے حضورؐ کے زخم دھو رہے تھے تو عمرؓ زخمی شیر کی طرح ابوسفیان کے نعرۂ کفر کے خلاف یوں گرج رہے تھے۔

"اللہ ـــ سب سے عظیم ہے ـــ اللہ کی بڑائی کی کوئی حد نہیں ـــ اور ـــ اللہ ہمارا ہے تمھارا نہیں ـــ

سُن لے او دشمنِ خدا کہ ہم سب زندہ ہیں ـــ محمدؐ بھی زندہ ہیں ـــ ابوبکرؓ بھی اور عمرؓ بھی ..... تاکہ کفر کو کیفرِ کردار تک پہنچا کر دم لیں ....."

غزوہ خندق کی برفانی راتیں بھی پھر عمرؓ کے سوز دروں کو ٹھنڈا نہ کر سکیں ـــ خندق کے جس کنارے پر وہ حضورؐ کے ارشاد گرامی پر جھلستے دن اور ٹھٹھرتی راتوں میں ایک زبردست چٹان کی طرح باطل کے ٹڈی دَل کے خلاف سینہ سپر رہے تھے وہاں آج بھی مردِ مومن کی یادگار میں "مسجد عمرؓ" قبلہ رو کھڑی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں عمر بن خطّاب نے تیروں کی بوچھار اور تلواروں کی چھاؤں میں جہاد و عزیمت کی نماز پڑھی تھی۔ صلح حدیبیہ کے نازک موقع پر جب خدا کی دُور رس مصلحتوں کے اشارے سے اللہ کے رسولؐ کفر و شرک کو بظاہر دب کر دعوتِ صلح و آشتی دے رہے تھے تو عمر فاروقؓ کی بیتابیٔ حق دیکھنے کے قابل تھی۔ ان کی سمجھ میں ہی نہ آتا تھا کہ جب تک عمر کے ہاتھ میں تلوار اور سینے میں حق کی تپش ہے وہ کس طرح یہ منظر دیکھنے کی تاب لائے کہ دعوتِ صلح و آشتی کے لیے حضورؐ کو ذرا بھی دبنا پڑ رہا ہے! ـــ ہائے وہ حسین حدادب ہیں ان کی غیرتِ حق کا اضطراب ـــ ہائے وہ بارگاہِ رسالت میں خدا کے اس جاں نثار بندے کا بچّوں کی طرح مچلنا!

"اے خدا کے رسولؐ! ..... کیا ..... ہم حق پر نہیں ہیں؟"

لیکن اللہ اللہ! وہ عظیم بندہ تسلیم و رضا کہ جسے ہی غیرت حق کے اس نیم بسمل

کو محمدؐ کی زبان سے یہ پتہ چلا کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے مشیّتِ خداوندی کے ٹھیک ٹھیک اشارے پر ہو رہا ہے تو دنیا نے دیکھا کہ حضرت عمرؓ فوراً سجدۂ اطاعت میں گر گئے ـــــ سجدے سے سر اٹھایا تو قدم قدم پر ایمان بالغیب کو درجۂ عین الیقین تک پہنچانے والے واقعات پیش آئے اور اسلام کی اُس شانِ مغلوبی کے افق سے فاتحانہ مستقبل کے ہزار آفتاب نمودار ہوتے چلے گئے۔

"اے خدا کے رسولؐ!" ایک دن حضرت عمرؓ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر والہانہ انداز میں عرض کیا۔ "مجھے اپنی جان کے سوا دنیا جہان کی ہر شے سے زیادہ آپؐ ہی عزیز ہیں ....."

یہ اس شخص کے بھاری الفاظ تھے جس کی زندگی غزوۂ تبوک کے موقع پر فرطِ عشق سے دو حصّوں میں بٹ گئی تھی ـــــ جس نے پوری زندگی اور متاعِ زندگی کے سچ مچ دو برابر ٹکڑے کر کے ایک فرائض دنیا کے لیے چھوڑا تھا اور دوسرا دین کے ہادیؐ کے قدموں میں صرف ایک جنگی مہم کے لیے لا ڈالا تھا ـــــ اُف! کتنے جان دار ہوتے ہیں اس شخص کے الفاظ جس کی عملی زندگی کا اتھاہ جذب وجنوں الفاظ سے آگے ہی آگے ہو۔ ہمیشہ آگے ہی آگے! لیکن "تکمیل ایمان" کی منزل تو آسمانوں سے بھی بلند تر ہے۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے لفظ وکردار کا اتنا عظیم سفر بھی کافی نہ تھا ـــــ ایک آسمانوں کو چھونے والی منزل جس کا طالب جذب وجنوں کے پَر لگا کر خدا کی سمت اڑتا ہے تو سارے جہان کے ساتھ خود اس کی اپنی جان کی محبت بھی اس کو پکارتی ہوئی پیچھے پھڑپھڑاتی ہی رہ جاتی ہے مگر عشقِ رسولؐ کا پروانہ اس وقت تک نہیں رکتا جب تک شمعِ توحید کے طواف شوق میں اس کا سب کچھ کام نہ آجائے۔

"نہیں عمر!" سرکارؐ نے جواب دیا "ایمان تو پورا جبھی ہوگا جبکہ میں تمھیں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز محسوس ہونے لگوں۔"

یکایک ایک بجلی سی چمکی، ایک خاموش زلزلہ سا آیا اور پھر اسی آن عمرؓ کے سینے

میں عشقِ رسولؐ کے جذبات سیلِ بے کراں میں تبدیل ہوتے چلے گئے ـــــ منزلِ تکمیل تک پہنچنے میں صرف ایک قدم کا فاصلہ دیکھ کر کمالِ ایمانی کے لیے ترستی ہوئی زندگی نے جست کی اور چشم زدن میں کمالِ ایمانی کی منزل کو چھو لیا۔

"اے خدا کے رسولؐ!" روحِ عمرؓ نے حضورؐ کو ہمیشہ سے زیادہ والہانہ عالم میں پکارا "اب آپ مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔"

اس دن وہ بزمِ رسولؐ سے ایک نئی تڑپ لے کر اُٹھے ـــــ اور پھر عمر بھر اس تڑپ نے ان کو کہیں چین سے بیٹھنے نہ دیا ـــــ اس میں نہ جانے کس بلا کا سرور و سکون تھا کہ عیش و عشرت ان کے پاؤں پڑتی تھی مگر وہ اسے ٹھوکر مارتے تھے۔ لذتیں ان کے ہاتھوں کو چومتی تھیں مگر وہ دونوں کو گھبرا گھبرا کر جھٹکتے تھے ـــــ اینٹ پتھر اور سونے چاندی کی اس دنیا میں بیٹھ کر وہ تو ہر لمحہ سوتے جاگتے خدا کے ان سدا بہار باغاتِ جنت کو اشک آلود اور پرشوق نظروں سے تکتے جا رہے تھے جن کے کنارے ابدی نہریں ابدیت کی حسین ترین موسیقی بکھیرتی ہوئی بہہ رہی ہیں۔ بہتی چلی جا رہی ہیں ـــــ نہ جانے کہاں سے ـــــ نہ جانے کہاں تک!!

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا یہ پہلو حضرت عمرؓ کے سامنے تھا کہ حق اپنی فتح و کامیابی کے لیے ساز و سامان کا محتاج نہیں ـــــ ایک اکیلا انسان محض خدا کے بھروسے پر کفر و درندگی کے ہولناک جنگل میں کھڑا ہو کر حق کی آواز بلند کر سکتا ہے۔ تیرہ سال تک ظلم و استبداد کی بدترین چکی بھی انسانی ہڈیوں کو تو پیس ڈال سکتی ہے مگر اس حق کی آواز کو کچل نہیں سکتی ـــــ اس حق و صداقت کے محض تین سو تیرہ بے سر و سامان شیدائی تیرہ سالہ مظلومیت کا خون ٹپکاتے ہوئے اُٹھتے ہیں تو محاذِ بدر پر سیکڑوں خوں آشاموں کی کلائیاں موڑ دیتے ہیں اور آخر آخر ـــــ فتحِ مکہ کے روشن دروازے سے یہی حق ـــــ "جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا" کا اعلان سناتا ہوا آتا ہے تو باطل کو نہ زمین پہ پناہ ملتی ہے اور نہ انسان کے تنگ و تاریک سینوں میں۔

خلافت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے اسی اسوۂ حسنہ پر بے جھجک چلتے گئے ـــــ انھوں نے جزیرہ نمائے عرب کے چٹیل ریگستان میں کھڑے ہو کر باغات اور کھیتوں سے لدی ہوئی سرزمینوں کو للکارا ـــ قیصر و کسریٰ کی طاقتوں کو خدا کے اقتدار اعلیٰ کا جلال انگیز پیام بھیجا تو سیکڑوں سالہ پائیدار حکومتوں کے پرخچے اُڑ گئے ـــــ قیصر کی سطوت و شکوہ کو نعرۂ تکبیر سے پاش پاش کر ڈالا۔ فراعنہ مصر کی سرزمین پر آسمانی قانون کا نفاذ کیا۔

حق کے دفاع میں ایک اٹل چٹان بن جانا اور حق کی پذیرائی میں موم سے زیادہ نرم ہو جانا انھوں نے اپنے آقا سے سیکھا تھا۔ یہ بات ان کے لیے کچھ مشکل نہ تھی کہ عظیم الشان فتوحات کے قائد حضرت سعدؓ ابن وقاص کے قصر کوفہ کی ڈیوڑھی کو آگ لگانے کا حکم دے دیں کیوں کہ اندیشہ تھا کہ یہ ڈیوڑھی حاکم و محکوم کے درمیان انصاف کی راہ میں دیوار بن کر حائل ہو گی ـــــ انصاف جو تقویٰ سے قریب ترین نسبت رکھتا ہے۔ اس کی حفاظت کی گئی اور حضرت سعدؓ بن وقاص کی آنکھوں کے سامنے حضرت عمرؓ کے ایلچی نے اس ڈیوڑھی کو نذر آتش کر دیا۔ ان کے لیے یہ بھی کچھ دشوار نہ تھا کہ حضرت خالدؓ بن ولید کو عین میدانِ جنگ میں اس لیے سپہ سالاری سے معزول کر دیں کیوں کہ اندیشہ ہو چلا تھا کہ اسلامی فتوحات کے لیے خالص خدا کی طرف دیکھنے کے بجائے لوگ خالدؓ کی تلوار کی طرف دیکھنے لگے ہیں۔ یہ سب کچھ ان کے لیے بہت آسان تھا ـــــ لیکن یہ بات ان کے بس میں نہ تھی کہ کوئی بھی شخص ـــــ معمولی سے معمولی شخص اٹھ کر انھیں خدا سے ڈرائے اور وہ خوف و خشیت کی شدت سے پتے کی مانند کانپ نہ جائیں۔

ایک بار دورِ خلافت میں جب وہ کسی مسئلے پر تقریر کر رہے تھے تو ایک معمولی سا شخص بیچ تقریر میں کھڑا ہو گیا اور تلخ و کرخت لہجے میں بولا۔

"اِتَّقِ اللّٰہ ـــــ یا عمرؓ! ـــــ اے عمر! اللہ سے ڈر!" ایک ہی تقریر میں ایک ہی شخص نے یہ مداخلت بار بار کی تو تمام حاضرین اس بے محابا اندازِ تنقید پر چراغ پا ہو گئے اور چاہا کہ اس آدمی کا منھ بند کر دیں ـــــ لیکن وہ بندۂ مومن جو کمال صبر سے

برسرِ منبر یہ تنقیدی کچوکے مسلسل سہہ رہا تھا اور اُف تک نہیں کر رہا تھا۔ لوگوں کے اشتعال پر خفا ہو گیا۔

"نہیں۔ نہیں" خوف و خشیت میں ڈوبی ہوئی آواز حضرت عمرؓ کے منھ سے بے تابانہ نکلی "نہیں، نہیں! کہنے دو۔ اگر یہ لوگ نہ کہیں تو یہ بے مصرف ہیں اور ہم نہ سنیں تو ہمارا مصرف کوئی نہیں۔"

ایک بار مہر کی رقم کو گھٹانے کے لیے انھوں نے امیر المومنین کے عظیم الشان منصب سے امت کو خطاب کیا کہ یکایک دورانِ تقریر میں ایک عورت نے کتاب و سنت کے حوالے سے حضرت عمرؓ کی تردید کرتے ہوئے پوری قوت سے کہا۔

"اے عمر! ــــ اللہ سے خوف کھا!"

اور حضرت عمرؓ کو فوراً خشیتِ الٰہی نے پکڑ لیا۔ وہ پورے جوش سے بولتے بولتے اس آواز پر گنگ ہو گئے اور کھڑے کھڑے کانپنے لگے۔

"مدینے کی عورتیں بھی ....." حق کے آگے بے تکلف ہتھیار ڈال دئے اور اس خاتون کو خراجِ عقیدت نذر کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا "مدینے کی عورتیں بھی عمرؓ سے زیادہ جانتی ہیں۔"

اسوۂ رسولؐ کی ان کو کیسی چاہت تھی اس کا کچھ اندازہ اس روایت سے ہوتا ہے۔ حضرت جابرؓ سے منقول ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدیہ میں آئی ہوئی ایک دیبا کی حسین قبا زیب تن فرمائی ــــ لیکن اس پیکرِ عبودیت کو دیر تک اس کو پہنے رہنا گوارا نہ ہوا۔ بہت جلد آپؐ نے اس کو اتار دیا، اور حضرت عمرؓ کو یہ تحفہ بھجوا دیا۔ کچھ دیر نہ ہوئی تھی کہ یہ بیش قیمت تحفہ لیے ہوئے حضرت عمرؓ بارگاہ رسولؐ میں دوڑے ہوئے آئے تو ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور آواز گلوگیر تھی۔

"حضورؐ" وہ بچوں کی طرح رو پڑے۔ "میں اس چیز کو آخر کیا کروں جس کو آپ نے ناپسند فرمایا ہے .....؟

سنت رسولؐ کے پروانے کو اس وقت قرار آیا جب یہ پتہ چلا کہ حضورؐ نے یہ قبا پہننے کے لیے نہیں بھیجی تھی بلکہ مقصد یہ تھا کہ اس کو فروخت کر کے اس کی رقم کو بہترین مصرف میں لایا جائے۔

ٹھیک اس وقت جب فقر و فاقہ کی طویل آزمائش میں کھرا اُترنے کے بعد اللہ کے بندوں پر دنیا کشادہ ہو رہی تھی ـــــ سونے چاندی کا ایک سیلاب تھا جو قیصر و کسریٰ کے مفتوح خزانوں سے بہتا چلا آ رہا تھا ـــــ غریب خوش حال اور محتاج مالا مال ہو رہے تھے ـــــ ہاں ٹھیک اسی وقت عمرؓ دولت دنیا سے دامن سمیٹ کر مُوتُوا قَبْلَ اَنْ تَمُوتُوا کی زندہ تصویر بنتے جا رہے تھے۔ خدا سے ملاقات کی آرزو میں گم ہو کر انھوں نے خود کو جیتے جی کفن پہنا لیا تھا۔ جنت میں خدائے غفور و رحیم کی میزبانی کے تصور میں غرق وہ تخت خلافت پر بیٹھے ہوئے چھوٹے موٹے کھانے کھاتے تھے اور بھوکوں کا پیٹ بھرنے کے لیے ایک مزدور کی طرح غلّے کی بوریاں ڈھو ڈھو کر بھوکوں کے گھر پہنچاتے تھے۔ ایسی ہی تو ایک رات تھی جب ایک دُور افتادہ جھونپڑی میں چولھا ٹھنڈا پا کر وہ بیت المال تک ہانپتے کانپتے آئے تھے اور پھر وہاں سے کھانے کا بھاری سامان اپنی کمر پر لادے ہوئے لرزاں و ترساں اسی دور افتادہ مسکن کی طرف بھاگے جا رہے تھے۔ غلام التجائیں کرتا ہوا پیچھے پیچھے دوڑا کہ آپ تھکان سے چور ہیں خدارا یہ بوجھ میری کمر پر لاد دیجیے ـــــ ورنہ آخر ہمارے وجود کا مقصد ہی کیا ہے؟ ـــــ مگر حضرت عمرؓ کو یہ کہاں ہوش تھا کہ ان کے وجود کا مقصد کیا ہے ـــــ انھیں تو خود اپنا مقصد حیات تڑپائے ہوئے تھا ـــــ وہ تو خدا کے بندے تھے اور انھیں اپنی رعایا کے دکھ درد کا پورا حساب خدا کو دینا تھا۔ جب غلام نے بہت زیادہ اصرار کیا تو ان الفاظ میں انھوں نے دل و جگر کا لہو نچوڑا ـــــ

"بتا کیا اس دن بھی جب خدا کی عدالت میں میرے لیے پکار لگ رہی ہو گی تو میرا بوجھ اُٹھا سکے گا.....؟"

حضرت امام حسنؓ کا بیان ہے کہ امیر المومنینؓ کی عظیم الشان حیثیت سے حضرت

عمرؓ امت مسلمہ کے سامنے خطبۂ جمعہ پیش فرما رہے تھے اور ٹھیک اس وقت جب وہ اللہ کے بندوں کو آخرت کی گھاٹیاں یاد دلا کر اللہ کے جلال سے لرز رہے تھے تو میں نے دیکھا کہ اللہ کا یہ عاجز بندہ پورے بارہ پیوند کا تہبند باندھے ہوئے تھا۔

اس دنیا میں کسی بھی وقت ان کو اپنے کفنائے جانے کا اتنا یقین تھا کہ ایک ہی جوڑے کو خود دھوتے اور سکھاتے ہوئے وہ اس سرائے فانی میں اپنے دن کاٹ رہے تھے۔ یہ جوڑا پھٹ کر بھی بدن سے جدا نہ ہوتا تھا ـــــ اس پر خود بھی پیوند لگاتے اور پیوند بھی جواب دے دیتا تو یہ لباس فقر ـــــ ہائے یہ لباس تقویٰ پیوند در پیوند اور پیوند بالائے پیوند کے عبرت خیز مرحلوں سے گزرتا تھا ـــــ انسؓ ابن مالک سے پوچھ لیجئے کہ کیا انھوں نے خطاب کے بیٹے کے بدن پر زمانہ خلافت میں وہ کرتا نہیں دیکھا تھا جس کے شانوں پر پیوندوں کے سوا کچھ بھی نظر نہ آتا تھا!۔

خدا کی قسم! یہ لباس گواہی دے رہا ہے کہ عمرؓ بن خطاب سچے دل سے بس خدا کے خریدار تھے اور خدا کے خریدار کو دولت دنیا کے خزانے کبھی نہیں خرید سکتے۔ اسی ایمان افروز گدڑی میں وہ اسلامی قلمرو کے شاہی معائنوں پر تشریف لے جاتے اور بڑی بڑی سلطنتوں کے کج کلاہوں سے آنکھیں چار کرتے تھے ـــــ فلسطین کی مہم پر جب ان کو بہ نفسِ نفیس روانہ ہونا پڑا تو جسم پر وہی پارہ پارہ پیوند کا کرتا تھا ـــــ سر پر وہی پھٹا ہوا عمامہ تھا اور پاؤں میں وہی ٹوٹی ہوئی جوتیاں ـــــ سواری ضرور ان کے ساتھ تھی مگر یہ سواری جب عیسائیوں کے فلسطین میں داخل ہو رہی تھی تو سواری کی باگ ان کے ہاتھ میں تھی اور سوار وہ غلام ہم راہی تھا جس کی سواری کی باری اس مقام پر آگئی تھی۔

یہ دیکھ کر کہ دن بدن بڑھتی پھیلتی چمکتی دمکتی اسلامی سلطنت کا یہ خدا ترس "فرماں روا" دن بدن خود کو قبر ہی میں اُتارے چلا جا رہا ہے۔ ایک بار ان کے پاس امہات المومنین حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کا وفد پہنچا اور صورتِ حال کی نزاکت سمجھائی۔

"آپ اپنے لباس کی طرف تھوڑی سی توجہ فرمائیں ـــــ آپ کو قیصر و کسریٰ کے سفیروں سے ملنا پڑتا ہے اور مسلمانوں کو شرم آتی ہے ....."

"افسوس!" آہ سرد کھینچتے ہوئے حضرت عمرؓ نے کہا۔ "افسوس! تم دونوں اُمت کی مائیں ہو کر مجھے دنیا طلبی کی ترغیب دے رہی ہو! اے عائشہؓ! کیا تم رسول اللہؐ کی اس حالت کو بھول گئیں کہ تمھارے گھر میں صرف ایک کپڑا تھا جس کو دن میں بچھایا جاتا اور رات کو اوڑھ لیا جاتا اور اے حفصہؓ! تم کو یاد نہیں کہ ایک بار تم نے فرش خواب کو دہرا کر کے بچھا دیا تھا تو رسول اللہؐ اس نرمی کے باعث رات بھر سوتے رہ گئے، اور پھر حضرت بلالؓ کی اذان پر گھبرا کر حضورؐ کی آنکھ کھلی تو آپؐ نے تمھارے اس عمل پر اظہار غم کرتے ہوئے فرمایا کہ "مجھے راحت دنیا سے کیا سروکار ـــــ اور فرش کی نرمی سے تم نے مجھے کیوں غافل کر دیا؟"

نہ جانے کس عالم میں حضرت عمرؓ درد دل بکھیر رہے تھے کہ امہات المؤمنین بے اختیار رو پڑیں اور دیر تک روتی رہیں ـــــ خود حضرت عمرؓ کا پورا وجود جیسے آنسوؤں میں نہا رہا تھا۔

ایک مرتبہ فقر کی سلطنت کا یہ شہنشاہ سفر شام پر نکلا تو وہاں کے مسلمان افسروں کو دیکھا کہ وہ پر تکلف حریر و دیبا کی قباؤں میں ان کا شاہانہ استقبال کرنے آئے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر ان کا چہرہ کبھی شدت غم سے زرد ہوتا تھا تو کبھی غصے کے مارے تمتما اُٹھتا تھا۔ یہ احساس ان کی دھڑکنوں پر تیشہ زنی کر رہا تھا کہ سلطنت کے عظیم پھیلاؤ کے ساتھ وہ "فقر" سمٹ رہا ہے ـــــ جس پر حضورؐ فخر کرتے تھے۔ اپنے اس استقبال و اعزاز پر وہ اپنے ہاتھ سے خاک ڈالتے ہوئے غم و غصہ کے عالم میں آگے بڑھے اور ان پر تکلف پوشاکوں پر سنگریزے مارتے ہوئے بولے:

"تم! ..... تم ..... اس وضع میں میرا استقبال کرتے ہو؟"

انھوں نے احنف بن قیس کو ایک جماعت کے ساتھ عراق کی تاریخی مہم پر روانہ کیا تھا۔ یہ لوگ وہاں سے فاتحانہ پلٹے تو ان کے جسم پر زرق برق ملبوسات نظر آ رہے

تھے۔ حضرت عمرؓ کے دل پر یہ تبدیلی تیر بن کر لگی۔ اس قدر خفا ہوئے کہ ان لوگوں کو دیکھ کر غصّے سے منھ پھیر لیا ـــــ جلال عمرؓ سے سہمے ہوئے یہ لوگ دربارِ خلافت سے اُٹھ آئے اور عرب کی سادہ پوشاک پہن کر دوبارہ حاضر خدمت ہوئے۔ اب ان کو حضرت عمرؓ نے دیکھا تو خوشی کے مارے بے قابو ہو گئے ـــــ بیتابانہ اپنی جگہ سے اٹھے اور ان سب کو ایک ایک کر کے سینے سے چمٹا لیا اور اس طرح حق پسندوں کے دامن سادگی کو خوشی اور قدر شناسی کے اشکوں سے تر کر دیا۔

ہائے یہ اللہ کا بندہ جب خلافت کے خزانوں کی کنجیاں جیب میں ڈالے ہوئے سرکاری اسفار کے مواقع پر بے تکلف پیڑوں کی چھاؤں میں اور فرش خاک پر لیٹ جاتا تھا تو دیکھنے والوں کو اس حقیقت کا کیسا یقین آتا ہوگا کہ مومن کا گھر تو بس خدا کی جنت ہی ہے اور اس جہان فانی میں تو اس کی حیثیت ایک "مسافر" بلکہ محض ایک "راہ گیر" کی ہے اور بس ـــــ سفر شام کے موقع پر جب اسلام کی فاتح قوتوں نے ان کو ایک قیمتی پوشاک نذر کرنی چاہی اور سواری کے لیے ایک صبا رفتار ترکی گھوڑا حاضر خدمت کیا تو انھوں نے درد بھرے انداز میں کہا۔

"خدا نے ہم کو جو عزت دی ہے وہ اسلام کی عزت ہے اور ہمارے لیے تو وہی بس ہے....."

وہ دل کی گہرائیوں سے اللہ کے غلام تھے۔ اس لیے غلاموں کا درد ان کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا اور اس طرح وہ حضورؐ کی اس پُرسوز وصیت پر جان و دل سے عمل پیرا ہوئے جب آپؐ نے دنیا سے جاتے جاتے حجۃ الوداع کے موقع پر یہ تاکید کی تھی اور بستر وفات پر جب آواز نے ساتھ چھوڑ دیا تھا تو اپنے لبوں کی آخری حرکت سے یہ درد بھری تنبیہ فرمائی تھی کہ :-

"نماز!..... نماز!..... اور وہ جو تمھارے دستِ نگر..... ہیں....."

چنانچہ حضرت عمرؓ نے تختِ خلافت پر آتے ہی عربی غلامی کو بیک قلم ختم کر ڈالا تھا اور غلام نوازیوں کا شان دار اُسوہ پیش کر کے گویا ہر قسم کی انسانی غلامی کے جسم

سے جان ہی نکال دی تھی ۔

آپ اپنی کمر پر لاد لاد کر بیت المال سے سامانِ خورد و نوش لے جاتے اور رات کے پرسکون لمحوں میں غلاموں کو پاؤں پھیلا کر سوتا ہوا چھوڑ کر یہ سامان بہ نفسِ نفیس غریبوں کو اور محتاجوں کے دُور افتادہ محلّوں میں تقسیم فرماتے تھے ـــــ فلسطین کے تاریخی سفر میں ان کی سواری پر ان کا غلام سوار تھا اور وہ خود ایک غلام کی طرح سواری کی باگ پکڑے ہوئے اپنے لباس اور قدموں کو گرد آلود کرتے ہوئے تشریف لے جا رہے تھے ایک دن صدقہ کے کسی اونٹ کے بدن پر تیل کی مالش اپنے ہاتھوں سے کرتے ہوئے پسینہ پسینہ ہو رہے تھے کہ کسی مسلمان نے پاس آکر دکھ بھری شکایت کی ۔ "یہ کام آپ خود کیوں کر رہے ہیں اے مومنوں کے سردار! ـــــ کسی غلام سے یہ خدمت لے لی ہوتی۔"

تیز اور تلخ انداز میں آپ نے اس شخص کی طرف دیکھا۔ جیسے کہنے والے نے ان کی عزت افزائی نہیں توہین کی تھی ۔

آخر مجھ سے بڑھ کر غلام کون ہو سکتا ہے؟" آپ نے پلٹ کر جواب دیا۔ "جو شخص مسلمانوں کا والی ہے وہ ان کا غلام بھی ہے ۔" کہنے والا اپنا سا منہ لے کر چلا گیا اور حضرت عمرؓ پھر اسی کام میں جٹ گئے ۔

خلافت ہی کا زمانہ تھا اور حضرت عمرؓ سر پر چادر ڈال کر کسی خدمت خاص پر روانہ ہوئے تھے واپسی میں بری طرح تھک گئے تھے ۔ دیکھا کہ ایک غلام گدھے پر سوار جا رہا ہے آپ نے اس کو آواز دی اور کہا :

"میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے بھی اپنے ساتھ بٹھا کر لے چلو....."

یہ سننا تھا کہ غلام فرطِ ادب اور کمال مسرت کے عالم میں سواری سے اُتر کر کھڑا ہو گیا اور بولا :

"اے امیر المومنین! بسر و چشم! یہ سواری پوری کی پوری حاضر خدمت ہے۔"

"نہیں" حضرت عمرؓ نے صاف صاف جواب دیا ـــــ یہ نہیں ہو سکتا کہ تمھیں میری وجہ سے تکلیف اٹھانی پڑے ۔"

"تو..... پھر کیا حکم ہے؟"

"تم جس طرح بیٹھے تھے اُسی طرح بیٹھ جاؤ۔" حضرت عمرؓ نے سیدھا سادہ حل پیش کرتے ہوئے کہا "اور میں تمھارے پیچھے بیٹھ جاؤں گا۔"

چنانچہ غلام کو بجبر و اکراہ ایسا ہی کرنا پڑا۔ جب یہ عجیب و غریب سواری مدینے کی گلیوں میں داخل ہوئی تو لوگ حیرت کے مارے یہ منظر پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ کر اشارے کر رہے تھے "دیکھ رہے ہو! — غلام کہاں بیٹھا ہوا ہے اور امیر المؤمنین کہاں! —"

ایک بار صفوان بن اُمیّہ نے ان کی خدمت میں لذیذ دسترخوان سجا کر بھیجا تو اس دسترخوان کے چاروں طرف فقیروں اور غلاموں کی بھیڑ جمع کر لی اور ان کے ساتھ بیٹھ کر یہ کھانا کھایا اور کھلایا — اخوت و مساوات کی مقدس قربان گاہ پر اس طرح عربی فخر و مباہات کو بھینٹ چڑھانے کے بعد آپ نے فرمایا "خدا کی پھٹکار ہو ان خود سروں پر جن کو غلاموں کے ساتھ کھانا کھانے سے عار آتا ہے۔"

خود اپنے کھانے پینے کا یہ حال تھا کہ لوگ ان کے "شاہی دسترخوان" سے جان بچا کر دور بھاگتے تھے۔ اس شاہی دسترخوان پر سوکھی روٹیوں اور بے مزہ سالنوں کے سوا اور ہوتا ہی کیا تھا۔ حضرت حفصؓ بن ابی العاص جو اکثر و بیشتر کھانے کے وقت موجود رہتے تھے۔ امیر المومنینؓ کے شریک طعام ہونے کا دل گردہ پیدا نہ کر سکے۔

"کیوں بھئی؟" ایک دن حضرت عمرؓ نے آخر ان سے پوچھ ہی لیا "تم ہمارے ساتھ کھانا کھانا پسند کیوں نہیں کرتے؟"

"جی؟" حضرت حفصؓ بن ابی العاص حیران تھے کہ بھلا یہ بات انھیں خود کیوں معلوم نہیں — کچھ دیر سوچا کیے آخر پھر صاف صاف کہہ دیا "بات یہ ہے اے امیر المومنین! اپنا مزے دار کھانا چھوڑ کر آپ کا یہ انتہائی موٹا جھوٹا کھانا حلق سے اُتارنا ہمارے بس کا کام نہیں۔"

درد و کرب کا ایک عجیب ایمان افروز رنگ حضرت عمرؓ کے چہرے پر کھیلنے

لگا۔ پھر غمِ آخرت سے بھیگی بھیگی آنکھوں میں جلالِ ایمانی کی چمک پیدا ہوئی۔

"کیا تم سمجھتے ہو..." سوزِ دل سے دہکتا ہوا جواب حضرت عمرؓ کے ہونٹوں پر آ ہی گیا "کیا تم سمجھتے ہو کہ میں قیمتی اور لذیذ کھانا کھانے کی مقدرت نہیں رکھتا؟ — قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر قیامت کا دھڑکا نہ لگا ہوتا تو تم لوگوں کی طرح میں بھی دنیا کے عیش و عشرت کا دلدادہ ہوتا....."

ایک بار عتبہ بن فرقد کو مجبوراً شریکِ طعام ہو جانا پڑا — بیٹھنے کو تو بیٹھ گئے مگر ایسا لگتا تھا کہ وہ بے کیف اُبلا ہوا گوشت اور سوکھی ہوئی روٹی کھا تو کیا رہے ہیں بمشکل "زہر مار" کر رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ کی نگاہ اٹھی تو ان کی حالت قابلِ رحم محسوس ہوئی۔

"تم سے کھایا نہیں جا رہا ہے تو مت کھاؤ۔" انھوں نے اپنے شریکِ طعام کو اس بے چارگی سے نکلنے کی چھوٹ دیتے ہوئے کہا۔ اور پھر خود اس کھانے کی طرف بہ صدائے شکر متوجہ ہو گئے۔

"اے امیر المومنین!" عتبہ بن فرقد نے حضرت عمرؓ کا یہ موڈ دیکھا تو کچھ ہمت بندھی اور محبت بھری جھنجھلاہٹ کے ساتھ کہہ دیا "اگر آپ اپنے کھانے پینے میں کچھ زیادہ صرف کرنے لگیں تو مسلمانوں کا خزانہ خالی نہ ہو جائے گا۔"

یکایک حضرت عمرؓ کھاتے کھاتے رک گئے۔ دل کی چوٹ آنکھوں سے ہویدا ہوئی۔ "افسوس!" آہ سرد کھینچتے ہوئے انھوں نے بس اتنا فرمایا۔ تم مجھے عیش دنیا کی پٹی پڑھاتے ہو؟....."

کچھ ایسی ہی تھی اس ہستی کی زندگی جسے اس دنیا میں دس خوش نصیبوں کے ساتھ رسول خداؐ کی زبان سے جنت کی نوید مل چکی تھی — کہاں ہیں وہ لوگ جن کا ایک ایک سانس دنیا طلبی میں گزر رہا ہے — جن کا پورا وجود دنیائے دنی کے قدموں میں پڑا ہے مگر پھر بھی خدائے رحیم و کریم کا وعدۂ رحمت وہ اپنے ہی لیے خاص سمجھتے ہیں —

خدا کے لیے وہ آئیں اور دوزخ کے خطرے کی آتشیں باڑھ کو چند طفل تسلیوں سے روکنے کے بجائے عمرؓ بن خطاب کی زندگی میں خدا کے وعدۂ جنت کی یقینی راہیں تلاش کریں ——— یہ حق کی پکار ہے یہ ضمیر کا مطالبہ ہے ——— یہ عقل و خرد کا مشورہ ہے ——— یہ اس زندگی کی خوں چکاں چیخ ہے جس کا خون موت کو دیکھ کر کسی بھی لمحہ رگوں میں ہمیشہ کے لیے خوف سے جم سکتا ہے۔

زندگی جو ایک سوال ہے کہ "کیا ہم مسلمان ہیں؟" ——— اور موت جو اس سوال کا ایک فیصلہ کن جواب ہوگی۔

کبھی اے نوجواں مسلم تدبّر بھی کیا تو نے؟
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا
تجھے آباء سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار وہ کردار تو ثابت وہ سیّارا

ہائے وہ سوداگری!

خدا کے آخری پیغام کے خلاف ابلیس نے مکّہ کے گھر گھر اور گلی کوچوں میں ظلم وستم کی حیوانی طاقتوں کو پوری طرح جگا دیا تھا ـــــ آگ! نفرت اور کینے کی آگ ـــــ ہر طرف آگ ہی آگ تھی ـــــ شعلوں کے بستر بچھائے جا رہے تھے ـــــ آنکھیں شعلہ باریاں کر رہی تھیں اور زبانوں سے آتشیں تیروں کی بوچھار ہو رہی تھی۔ وحشت و بربریت کے اس جنگل میں اہل ایمان اپنا سب کچھ نثار کر کے ایمان کی حفاظت کر رہے تھے ـــــ اور جب ناقابلِ برداشت حالات میں حبشہ کی طرف ہجرت کا دور آیا تو جو لوگ اپنے ایمان و یقین کو سینے سے لگائے ہوئے اپنا سب کچھ قربان کر کے مکّے سے حبشے کی طرف چل کھڑے ہوئے ان میں حضرت عثمانؓ اور ان کی اہلیہ حضرت رُقیّہؓ بھی شامل تھیں ـــــ حضرت ابراہیمؑ کے بعد یہ پہلا انسانی جوڑا تھا جس نے خدا کے نام پر وطن کی قربانی پیش کی تھی ـــ مکّے میں اسلام کی کامیابی کی غلط افواہ پر جو لوگ ایک بار پھر مکّہ واپس آئے ان میں حضرت عثمانؓ بھی تھے لیکن جوں ہی یہ معلوم ہوا کہ خبر غلط ہے انھوں نے پھر اس وطن سے منھ پھیر لیا جہاں ان کے جسم کے لیے تو جگہ تھی مگر ان کے دین کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔

حبشہ میں خدا کا نام بلند کرنے کے بعد یہ قافلہ مدینے کی طرف ہجرت کرتا ہوا وہاں خدا کے رسول سے جا ملا۔ ابھی ان خانہ بدوش بلا کشانِ راہ حق کے قدموں کے چھالے مندمل بھی نہ ہوئے تھے کہ بدر کے محاذ پر کفر و اسلام کے پہلے معرکے نے آواز دی ـــــ یہ وہ دور تھا جب راہِ حق کے مصائب جھیلنے کے بعد حضرت رقیہؓ بستر علالت پر کروٹیں بدل رہی تھیں ـــــ حضرت عثمانؓ چاہتے تھے کہ وہ اس معرکہ کارزار میں بے خطر کود پڑیں مگر خدا کے رسولؐ نے ان کو ان کی بیمار بیوی کی تیمارداری پر مامور فرما دیا۔ اس طرح حضرت عثمانِ غنیؓ کو ایک کے بجائے دو جہاد کرنے پڑے ـــــ ان کا جسم راہ حق میں

ساتھ دینے والی رفیقۂ حیات کے ساتھ تھا مگر ان کی روح میدانِ بدر میں خدا کے رسولؐ کے دوش بہ دوش چل رہی تھی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جب بدر کی فتح کے بعد مالِ غنیمت تقسیم ہوا تو خدا کے رسولؐ نے عثمان غنیؓ کا بھی حصہ لگایا۔ مال و دولت کے خزانے کتنے ڈھیر اس سے پہلے بھی انھوں نے اپنے دامن میں آتے ہوئے دیکھے تھے مگر یہ مال! ـــــ یہ تو چیز ہی کچھ اور تھا! ـــــ اس میں نظروں کو خیرہ کرنے والی چمک نہ تھی مگر روح و دل کے ایوانوں کو روشن کر دینے والا سیلِ نور اس کے اندر سے اُبل رہا تھا ـــــ یہ اعلان تھا گویا اس قابلِ صد فخر حقیقت کا کہ عثمان غنیؓ بھی بدری صحابیوں میں سے ہیں ـــــ انھوں نے بھی اپنے قلب و روح کے ساتھ حق و باطل کے اس اوّلین قتال میں خونِ دل و جگر سے حصہ لیا ہے ـــــ لیکن ابھی وہ تحفۂ خداوندی پر شکرِ نعمت کا امتحان دے ہی رہے تھے کہ صبر و استقامت کی ایک اور کڑی آزمائش ان کے سفرِ آخرت کے ایک نئے زادِ راہ کے طور پر سامنے آگئی ـــــ وہی بیوی جس نے ان کے شانہ بشانہ رہ کر راہِ حق کے نشیب و فراز دیس بدیس کی ٹھوکریں کھائی تھیں ـــــ مصائب کے زخم ہنس ہنس کر اپنے مقدس سینے پر سہے تھے ـــــ ہاں وہی شریکِ حیات جس کی رگوں میں خدا کے آخری محبوب ترین رسولؐ کا پاکیزہ ترین خون گردش کر رہا تھا "دارالقرار" کے لیے پابہ رکاب تھیں! ـــــ ایک سفرِ دراز جس پر انھیں تنِ تنہا جانا تھا ـــــ عثمان غنیؓ ان کے وفا کیش اور وفا نواز شوہر بھی اس میں ان کے ساتھ نہیں جا سکتے تھے۔ وہ بیوی جس نے قدم قدم پر ان کا ساتھ دیا تھا اب اس کو وہ شک آلود آنکھوں اور لرزہ براندام دل کے ساتھ "خدا حافظ" کہہ رہے تھے ـــــ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کو سپردِ خاک کرنے کے بعد جب وہ ایک طرف ایسی قیمتی رفاقت سے محرومی پر اشک بار ہو رہے تھے تو دوسری طرف آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دامادی کی عظیم نسبت کا خاتمہ ان کے دل و جگر کو لہولہو کر رہا تھا ـــــ لیکن اس جہادِ زندگی میں بھی انھیں خدا نے ایک ایسے انعام سے نوازا جو ان کے سوا کسی بھی دوسرے صحابیٔ رسولؐ کے ہاتھ نہ آسکا تھا ـــــ حضورؐ نے ان کے نکاح میں اپنی دوسری صاحبزادی حضرت اُمِّ کلثومؓ کو پیش کر کے عثمان غنیؓ

کو عثمان ذوالنورین کے تاریخی خطاب سے سرفراز فرما دیا ـــــ لیکن یہ نعمت بھی امتحانِ شکر بن کر آئی اور بہت جلد امتحانِ صبر بن کر چلی گئی ۔ جلد ہی ایک بار پھر ان کے قلب پہ ٹھیک اسی جگہ نیا گھاؤ لگا جہاں حضرت رقیہؓ کی موت سے اس سے قبل لگ چکا تھا۔ بظاہر وہ دو نور والے عثمان تھے مگر ان کے اندروں میں آزمائش و ابتلا کے دو زخم چاند اور سورج کی طرح آمنے سامنے کھڑے ہو گئے تھے ـــــ شاید یہی تھے وہ زخم جن کے نتیجے میں دنیا کی محبت کی تمام جڑیں کٹ کر رہ گئیں ـــــ دنیا اور اس کی تمام روپہلی سنہری دولت ان کی نظروں میں ٹھیکروں کا ڈھیر بن گئی اور اس دنیا میں سب سے اچھی جگہ ان کے بدلے قبرستان نے لے لی جہاں جانا اور قبروں کے بند دریچوں سے آخرت کے اس پار جھانکتے رہنا ان کے سکون دل کا سب سے بڑا ذریعہ بن گیا ـــــ وہاں ان کے قلب پر آنے والی ابدی حقیقتوں کے سائے لہرانے لگتے اور زندگی و موت اور حشر و نشر کے سربستہ راز بے حجاب ہو کر ان کے ایمان میں معرفت کا لازوال رس گھولنے لگتے تھے ۔ کسی نے ان سے جب قبرستانوں سے اس غیر معمولی وابستگی کی وجہ معلوم کرنا چاہی تو اس کے جواب میں انھوں نے ایسا اشارہ کیا جس کی تشریح کے لیے دفتر بھی کافی نہ ہوں ـــــ انھوں نے کہا :

"مُردوں میں مجھے دو ایسی خوبیاں ملیں جو بہت کم زندوں میں نظر آتی ہیں ـــــ ایک تو یہ کہ میں جب تک ان کے پاس بیٹھا رہتا ہوں وہ کوئی ایک بھی فضول بات مجھ سے نہیں کرتے ۔ دوسری یہ کہ جب میں ان کے پاس سے اُٹھ کر چلا آتا ہوں تو پیٹھ پیچھے مجھے بُرا نہیں کہتے ۔"

جب رسولؐ خدا ہجرت کر کے مدینے تشریف لائے تو میٹھے پانی کی آپؐ کو اور آپ کے اصحاب کو بڑی تکلیف تھی ۔ یہاں صرف ایک ہی میٹھا کنواں "رومہ" تھا جو ایک یہودی کے قبضے میں تھا اور وہ من مانے داموں اس کا پانی فروخت کیا کرتا تھا۔ ایک دن حضرت عثمانؓ نے یہ سنا کہ اللہ کے رسولؐ اس صورتِ حال سے پریشانی کے عالم میں یہ فرما رہے ہیں ـــــ

"جو شخص اس کنویں کو خرید کر اس کو خدا کی راہ میں وقف کر دے اس کے لیے

خدا کی جنّت ہے۔"

حضرت عثمانؓ دولتِ دنیا کو لیے ہوئے آگے بڑھے اور اس آواز پر دونوں ہاتھوں سے اس کو لٹا دیا ــــ کنواں خریدا اور خدا کے حوالے کر دیا۔

ایک بار پھر ایسی ہی آواز ان کے کانوں میں پہنچی اور وہ اس پر سراپا گوش ہو گئے یہ مسجد نبوی کی متصل زمین کو خرید کر مسجد کی توسیع کا معاملہ تھا۔

"جو شخص اس زمین کو خرید کر اسے میری مسجد میں شامل کر دے اس کو خدا کی جنت ملے۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان عام فرمایا ــــ دوسرے ہی لمحے حضرت عثمانؓ پھر میدان میں نظر آئے ــــ زمین کو خریدا اور اسے خدا کے گھر میں ملا دیا۔

غزوۂ تبوک میں حضرت عثمانؓ کا جذبۂ انفاق و ایثار دیدنی تھا ــــ یہی تھا وہ وقت جب وقت کے منافق لوگوں کو معاشی خطرات کے احساسات میں دھکیل کر اندیشۂ آخرت سے خالی کر دینے کی آوازیں بلند کر رہے تھے ــــ دولت کی قیمت سمجھائی جا رہی تھی ــــ کھیتوں کی حفاظت کی اہمیت پر زور دیا جا رہا تھا۔ اسی خود پرستی اور دنیا پرستی کے شور و غل میں انھوں نے ایک بار پھر اللہ کے رسولؐ کی یہ نوائے درد سنی!

"جو شخص راہ خدا کے اس لشکر کا ساز و سامان درست کر دے اس کو جنّت ملے گی۔"

"یا رسول اللہ!" حضرت عثمانِ غنیؓ پکار اٹھے۔ "میں سو اونٹ پیش کرتا ہوں۔"

خدا کے رسولؐ نے ایک بار پھر اسی آواز کے ذریعہ بندگانِ خدا کو مزید صدقات پر اُبھارا۔

"یا رسول اللہ!" عثمانؓ پھر پکار اُٹھے "میں دو سو اونٹ پیش کروں گا۔"

تیسری بار پھر خدا کے رسولؐ نے وہی آواز لگائی۔

"یا رسول اللہ!" عثمان غنیؓ نے پھر بیتابانہ جواب دیا۔ "میں تین سو اونٹ نذر کرتا ہوں۔"

چوتھی بار پھر خدا کے رسولؐ نے مومنوں کے جذبۂ انفاق و ایثار کو اسی آہنگ میں صدا دی۔

یہ آواز سنتے ہی حضرت عثمانؓ وہاں سے تیزی سے اٹھے اور گھر میں داخل ہوئے گھر میں ایک ہزار اشرفیاں نظروں کے سامنے تھیں، ان سب کو انھوں نے دامن میں سمیٹے ہوئے مسجد نبوی کا رُخ کیا اور یہ ساری پونجی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس قدموں میں لا ڈالی۔ آں حضرتؐ اس وقت ممبر پر کھڑے ہوئے تھے۔ اس کے بعد آپ بیٹھ گئے۔ فرطِ مسرت سے آپؐ کا چہرۂ انور گلنار ہو گیا اور جذبۂ انفاق و ایثار کے اس سُرخ سُرخ تحفے کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں لیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"آج کے بعد ـــــ آج کے بعد عثمانؓ خواہ کچھ کریں انھیں کوئی چیز نقصان نہیں پہنچا سکتی ـــــ کوئی چیز انھیں نقصان نہیں پہنچا سکتی۔"

حضرت عثمانؓ نے یہ سنا تو انھیں محسوس ہوا جیسے خدا کی جنت سچ مچ ان کی جھولی میں آگئی ہے ـــــ ان کو بدر کے مالِ غنیمت سے بھی فخر و مسرت کی دولت ملی تھی ان کو حضورؐ کی دو صاحبزادیوں سے نکاح کا اعزاز ملا تھا۔ انھیں حضورؐ کی یہ جاں نواز آواز بھی کبھی سنائی دی تھی کہ اگر میری دوسری بیٹیاں اور ہوتیں تو میں عثمان کے نکاح میں ان کو دیئے چلا جاتا ـــــ لیکن غزوۂ تبوک کے موقع پر زبانِ وحی ترجمان سے یہ آوازِ شوق ان کے لیے ایک ایسی نعمتِ لازوال تھی جس کے احساس سے وہ خوشی کے مارے رو دیئے ـــــ اور فخر و سرور کے شدید ارتعاش نے ان کے سارے وجود کو سجدۂ شکر میں ڈھال دیا ایسی ہی روحانی مسرت کا تجربہ انھیں حدیبیہ کے موقع پر ہوا تھا۔ جب مال کے بجائے جان کی بازی لگانے کے لیے مکّے میں سفارت کے فرض کی آواز حضورؐ کے ہونٹوں پر بلند ہوئی تھی ـــــ عثمان غنیؓ نے وہاں بھی خود کو اسی طرح پیش کیا تھا ـــــ اور جب ان کی شہادت کی غلط خبر کے بعد اللہ کے رسولؐ نے شجرِ رضوان کے سائے میں اللہ کے بندوں سے سب کچھ لٹانے کا عہد لیا تو اپنے ایک ہاتھ پر حضورؐ نے دوسرا ہاتھ رکھتے ہوئے اعلان فرمایا "یہ عثمان کا ہاتھ ہے ـــــ یہ ان کی طرف سے سپردگی کا عہد ایمانی ہے" ـــــ اور جب شہادت کی غلط خبر کی تردید ہونے کے بعد بعض مسلمانوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ عثمانؓ کیسے خوش نصیب

ہیں کہ انھوں نے کعبہ کا طواف کر لیا ہوگا تو خدا کے رسولؐ نے عثمان غنیؓ کے ساتھ اپنے اس حسن ظن کا اظہار فرمایا کہ "مجھے ان سے یہ توقع نہیں کہ ہمارے بغیر انھوں نے تنہا خدا کے گھر کا طواف کر لیا ہوگا" ۔ اور جب حضرت عثمانؓ زندہ و سلامت واپس آئے اور ان کو حضورؐ کی اس توقع کا علم ہوا تو خوشی اور فخر کے جذبات سے بھرّائی ہوئی آواز میں انھوں نے لوگوں کو بتایا کہ "یہ خدا کا کتنا بڑا فضل ہے کہ اس کے رسولؐ نے مجھ سے جو توقع قائم کی تھی وہ غلط ثابت نہیں ہوئی ـــــ مجھ سے کہا گیا تھا کہ میں اگر چاہوں تو تنہا کعبے کا طواف کر سکتا ہوں اور خانۂ کعبہ اپنے تمام حسن و جمال کے ساتھ مجھے اپنی طرف کھینچے لے رہا تھا مگر آنحضرتؐ کے بغیر تنہا یہ روحانی لطف حاصل کرنے کے خیال ہی سے میری روح پانی پانی ہو گئی" اور میں نے اہل مکہ کی اس پیش کش کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

خدا کے آخری رسولؐ کا عثمان غنیؓ کے ساتھ یہ حسنِ ظن بڑھتا اور پھیلتا ہی چلا گیا۔ یہاں تک کہ مستقبل کے ہولناک اور تاریک ترین فتنوں میں بھی یہ حسن ظن حضرت عثمانؓ کی قسمت کا تابناک فیصلہ بن گیا۔ خدا کے رسولؐ نے ایک نقاب پوش شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے صحابہؓ سے ارشاد فرمایا کہ "فتنوں کے وقت یہ شخص حق پر ہوگا" ـــــ لوگ تیزی سے اس گزرتے ہوئے شخص تک پہنچے تو دیکھا کہ یہ حضرت عثمانؓ ہی تھے ـــــ پوچھا گیا کہ "کیا یہی شخص؟" ـــــ اور پیغمبرؐ نے جواب دیا "ہاں ہاں یہی شخص!" ـــــ اور اسی "شخص" سے آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا:

"اے عثمانؓ، دیکھنا تمھیں ایک قمیص پہنائی جائے گی اور لوگ اس کو اُتارنا چاہیں گے ـــ لیکن اگر تم نے اس کو اتار دیا تو جنت کی خوشبو تک تمھیں نصیب نہ ہوگی" ـــ اور خلافت کی یہ قمیص جب ان کی زندگی کا آخری اور سب سے بڑا امتحان بن کر سامنے آئی تو بڑی سے بڑی تکلیف اور بڑے سے بڑا خطرہ دنیا میں اس قمیص کو اس وقت سے پہلے ان کے بدن پر سے نہ اُتار سکا۔ جب تک یہ قمیص خود ان کے خونِ شہادت سے تربتر نہ ہو کر رہ گئی ـــــ وہ اس کی راہ میں تشنگی کی اس منزل کرب و بلا سے گزرے کہ جہاں ان کے محصور اہل و عیال پانی

کی ایک ایک بوند کو ترسا دیئے گئے۔ انھوں نے مکان کی بلندی پر سے مکان کو گھیرنے والوں کو آواز دی۔ "میں ہی وہ ہوں جس نے حضورؐ اور ان کے اصحاب کے لیے میٹھے پانی کا کنواں خرید کر وقف کیا تھا اور میں ہی وہ ہوں کہ آج میرے گھر والے ٹھنڈے پانی کی ایک ایک بوند کو ترس رہے ہیں۔"

اس دور بے چارگی پر تڑپتی ہوئی کتنی ہی انسانی روحوں نے تڑپ کر کہا "تو پھر ان محاصرہ کرنے والوں کے خلاف تلواروں کو بے نیام ہونے کا حکم دے دیجئے۔"

اور عثمان غنیؓ نے آہ سرد بھرتے ہوئے جواب دیا ــــ "یہ کیسے ممکن ہے کہ میں لا الٰہ الا اللہ کہنے والوں کے خون سے مسلمانوں کی تلواروں کو رنگین ہو جانے دوں۔!"

"تو پھر" دوسری آواز بلند ہوئی "یہاں سے ہٹ جائیے اور اس منصب ہی سے دست برداری دے دیجئے۔"

اور حضرت عثمان غنیؓ کی روح ماضی میں آنحضرتؐ کی اسی تاکیدی گفتگو کی بازگشت میں ڈوبتے ہوئے پکار اُٹھی "نہیں ــــ یہ بھی ممکن نہیں، اس قمیص کو میں جیتے جی کیسے اتار سکتا ہوں کہ جس کے اتارنے کے معنی یہ ہیں کہ عثمانؓ خود کو جنت کی خوشبو تک سے محروم ہو جانے دے۔"

اور اسی فیصلے پر اپنا سب کچھ داؤں پر لگاتے ہوئے وہ جس وقت گھر میں کود کر آنے والے قاتلوں کی تلواروں کو اپنے اوپر خوف ناک بجلیوں کی طرح کوندتا ہوا دیکھ رہے تھے تو اس وقت بھی انھوں نے دنیا اور اس کی دولت و حکومت کی طرف ایک نظر بھی تو نہ ڈالی ــــ اس وقت بھی ان کے سامنے صرف ایک چیز تھی اور وہ خدا کی کتاب تھی جس کے کھلے ہوئے اوراق پر نظر جمائے وہ شہادت کے خون میں نہا رہے تھے اور ان کا مقدس خون قرآن شریف کی ان آیات پر ٹپک رہا تھا۔ "فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ" ــــ (ان سب سے نبٹنے کے لیے تیرے لیے اللہ کافی ہے اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے) کون کہہ سکتا ہے کہ ایک ایسا بندۂ مومن میدانِ اُحد سے اس لیے راہ فرار اختیار کر سکتا تھا کہ اس کی جان بچ جائے خواہ جنت ہاتھ سے

کیوں نہ نکل جائے! ـــــ میدانِ اُحد میں حضورؐ کی شہادت کی غلط مگر برق پاش خبر کو سُن کر خواہ ان کے اوپر جو کچھ گزر گئی ہو جان کی محبت ان کو مقامِ جہاد سے ہرگز نہیں ہٹا سکتی کہ جن کو صرف یہ خوف کہ وہ جنت کی خوشبو سے محروم نہ ہو جائیں، ہولناک ابتلاؤں اور برہنہ تلواروں کی چھاؤں میں صبر و استقامت اور ایمانی سپردگی کی چٹان بنائے ہوئے تھا ـــــ فرار کی راہ تو کیسی، انھوں نے تو اپنی جان کی حفاظت کے لیے اتنا بھی گوارا نہ کیا کہ مسلمانوں کی تلواروں سے ان مسلمانوں کا خون ہو جانے دیں جو فتنہ کار طاقتوں کے طلسم کا شکار ہو کر ان کے خون کی چھینٹوں سے قرآن کے صفحات کو رنگین ہوتا ہوا دیکھنے والے تھے۔

حضرت صدیق اکبرؓ کے عہد میں جس وقت امت قحط سے دوچار ہوئی تو انھوں نے اپنے اس مکاشفے کا اعلان فرمایا۔ "آج شام تک اللہ تمھاری پریشانی دور کر دے گا۔"

یہ پریشانی دور کرنے کا سہرا عثمان غنیؓ کے ہی سر بندھنے والا تھا جو انسان سے تجارت کرنے کے بجائے خدا سے تجارت کرنے کے دھنی تھے جس کا انعام آنحضرتؐ نے آخرت کے دردناک عذاب سے نجات قرار دیا ہے۔ اسی شام ان کے ایک ہزار غلّے سے لدے ہوئے اونٹ بستی میں داخل ہوئے تو مدینے کے تاجر ان کی خریداری کے لیے ہجوم کر آئے۔

"تم لوگ ملک شام کی اس خرید پر مجھے کتنا نفع دے سکتے ہو؟" حضرت عثمانؓ نے خریداروں سے سوال کیا۔

"دس روپے پر بارہ روپے۔" تاجروں نے بولی لگائی۔

"مجھے اس سے زیادہ مل رہا ہے۔" حضرت عثمانؓ نے جواب دیا۔

"اچھا دس روپے پر پندرہ روپے" تجارت کرنے والے انسانوں نے دوسری بولی لگائی۔

"مجھے اس سے بھی زیادہ مل رہا ہے۔" حضرت عثمانؓ نے ارشاد فرمایا۔

"آخر وہ زیادہ دینے والا کون ہے؟" تاجروں نے حیرت بھرا سوال کیا۔

"مدینے کے تاجر تو ہم ہی لوگ ہیں۔"

"مجھے ایک روپے کے مال کی دس روپے قیمت مل رہی ہے۔" حضرت عثمانؓ نے تاجروں کی حیرت میں اضافہ کرنے والا جواب دیا۔ "کیا تم اس سے زائد دے سکتے ہو ــــ؟"

"جی نہیں!....." حیرت سے کھلے ہوئے منھ سے لوگوں نے جواب دیا۔

"پھر تم سب گواہ ہو جاؤ۔" حضرت عثمانؓ نے انکشاف راز کرتے ہوئے فرمایا۔ "میں نے یہ سب غلّہ خدا کی راہ میں صدقہ کر دیا۔"

اور ــــ اسی رات کو حضرت عباسؓ کے صاحبزادے حضرت عبداللہؓ نے خواب میں دیکھا کہ حضورؐ ایک سفید فام ترکی گھوڑے پر سوار ہیں اور نورانی لباس زیب تن ہے اور کہیں جانے کی عجلت فرما رہے ہیں۔ انھوں نے عرض کیا "یا رسول اللہؐ! آپ کو کہاں جانے کی جلدی ہے ــــ مجھے تو آپؐ کی زیارت کا بے حد اشتیاق تھا۔" جواب ملا "اس وقت مجھے جانے کی جلدی اس لیے ہے کہ عثمانؓ نے ایک ہزار اونٹ غلّے کے خیرات کیے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے قبول فرما لیا ہے اور اس کے صلے میں جنت کی ایک حور سے ان کا نکاح ہو رہا ہے ــــ مجھے اس تقریب عروسی میں شریک ہونا ہے۔"

یہ تھے وہ مسلمان جنھوں نے خدا سے جنت کی خریداری کا عہد کیا اور اس عہد کو جان و مال دے کر پورا کیا ــــ ہم نے بھی ٹھیک یہی عہد اپنے رب سے کیا ہے اور حضورؐ کا نام لے کر کیا ہے ــــ لیکن ہماری خواہش یہ ہے کہ ہماری زندگی کی ساری توانائیاں ــــ ساری قوتیں اور ساز و سامان اس جہان فانی کی خریداری پر کھپ جائیں اور خدا اپنی جنت مفت میں ہمارے دامن میں ڈال دے ــــ کیا کبھی بھی ہمیں اپنی اس بدمعاملگی پر خدا کے حضور شرم آئی ہے؟ ــــ کیا کبھی ہمیں اس شرمندگی کے احساس نے زندگی میں صرف ایک بار ــــ ایک ساعت کے لیے بھی رُلایا ہے؟ کیا ہم مسلمان ہیں؟ ــــ آہ کیا واقعی ہم مسلمان ہیں؟

یہ عمر یہ عزائم!

چھٹی صدی عیسوی کی ایک سیاہ رات میں جب آخری رسالت کا آفتاب طلوع ہوا تو علیؓ ابن ابی طالب صرف دس سال کے تھے۔ اس سیاہ تاریخی رات میں اس دس سالہ بچے نے آفتاب رسالتؐ کا سب سے پہلا حسین ترین اور عجیب ترین منظر دیکھا۔ ایک نیا انسانی اتحاد حیات و کائنات کے خدائے واحد کے اَن دیکھے قدموں پر اس عظیم ترین انسانؐ اور خود اس کی شریک زندگی خدیجہؓ کے متحدہ سجدے کی شکل میں طلوع ہو رہا ہے۔ جس خدا کی وحدت سے کٹ کر ہی انسانی وحدت کے پرخچے اڑ رہے تھے اسی کے آستانے پر خدا کے نام پر جڑا ہوا ایک انسانی جوڑا وحدت کی عملی تصویر پیش کر رہا تھا۔ کتنا مخلص اور سچا تھا وہ انسان جس کے اتحاد پر اس کے خلوص و صداقت کی پہلی گواہ خود اس کی بیوی تھی۔ گھر کی بھیدی تھی۔

علی ابن ابی طالب نے اپنے چچازاد بھائی حضرت محمدؐ اور حضرت خدیجہؓ کے اس سجدۂ توحید کے بعد بے تابانہ سوال کیا ــ "یہ کیا ہے جو میں دیکھ رہا ہوں؟" جواب ملا ــ "یہی ہے انسانیت کی کھوئی ہوئی جنت جس کو گم کر کے ہی یہ دنیا جہنم بن کر رہ گئی ہے۔ اے علی، یہی تھا ہمارے باپ ابراہیم کا اصل دین" ــــ "کتنا حسین تھا یہ دین!" علی کی معصوم روح پکار اٹھی ــــ "آہ۔ لیکن اب وہی دین کیا سے کیا ہو کر رہ گیا ہے....."

اور ایک دن جب یہ بچہ بھی ان دونوں کے ایسے ہی سجدۂ نیاز میں شامل ہو گیا تھا اس کے باپ ابوطالب ادھر آ پہنچے! پھوٹ اور درندگی کی خوفناک آندھیوں میں یہ تین خوب صورت چراغ کیسے روشن ہیں! ــــ یہ والہانہ سوال اس سجدے کے بعد خود ابوطالب کے ہونٹوں پر تھرتھرا رہا تھا۔ پھر وہی سنسنی خیز جواب! ــــ

حضرت محمدؐ کی درد بھری آواز نشر کرتی ہوئی سنی گئی ۔ "اے چچا، یہ ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کا اصل دین ہے جو گم ہوا تو سب کچھ گم ہو کر رہ گیا!" ـــــ "کیا اس گم شدہ جنت میں آپ داخل نہیں ہوں گے؟ کیا آبا و اجدادِ اوّل کا یہ خزانہ آپ قبول نہیں کریں گے....؟"

اور ..... ابوطالب کا پورا وجود دو متضاد جذبات کی چکی میں پستا ہوا محسوس ہوا۔ ان کا دل اس سچائی کے منظر کی تصدیق کر رہا تھا مگر دماغ! ـــــ آہ! اس کے سامنے نفع نقصان، خدا اور انسان کے دو پہلو سامنے آکر ٹکرانے لگے ـــــ وہ ابھی انسان سے ٹکرانے اور نئی دنیا بنانے کے لیے پرانی دنیا کو ڈھانے کے لیے تیار نہ ہو سکے تھے۔ انھوں نے کہا ـــــ

"میرے بھتیجے میں دل سے تمھارے ساتھ ہوں ـــــ اور اے علی تم محمدؐ کا ساتھ دو اور اس کے ساتھ ساتھ چلو۔ محمدؐ کسی کو غلط راہ پر لے جانے والا انسان ہی نہیں ہے ـــــ لیکن میں اس بات کو کس طرح سے کہوں۔ ابھی یہ طاقت مجھ میں نہیں ہے۔"

اور اس طرح علیؓ جس سوال کا جواب اپنے باپ کی زبان سے ڈھونڈ رہے تھے وہ ان سے پوچھے بغیر خود خدا نے ان کے والد کی زبان اور دل دونوں سے دلا دیا تھا۔ انھیں خوب معلوم ہو گیا تھا کہ خدا کی سمت میں واپس ہوتے ہوئے انھیں خود اپنے آبائی خون کی اس کمزوری سے لڑنا پڑے گا ـــــ زبان و دل کے درمیان دودھ اور خون کی پشتینی خلش اپنے خون اور آنسوؤں سے پاٹنی ہو گی! یہی تھا وہ پہلا عزم ایثار، پہلا جذبۂ شہادتِ حق جس کا نام خدا کے یہاں "اسد اللّٰہیت" ہے ـــــ "ذوالفقاریت" ہے ـــــ "شیر خدا" وہ اسی بات پر خدا کے یہاں آسمانوں پر کہلائے گئے ہوں گے اسی دن انھیں 'ذوالفقار' کا خطاب ملا ہو گا ـــــ اللہ کے دیے ہوئے اسی اعزاز کا اظہار پھر رسول اللہؐ کے ذریعہ ملے ہوئے خطاب اور تلوار کی شکل میں یہودیت سے جنگ کے موقع پر آئندہ چل کر ہوا۔

کتنی زبردست طاقت تھی جو اس دور سیاہ میں حضرت محمدؐ، حضرت خدیجہؓ

اور حضرت علیؓ کی تین روحوں کی نماز توحید میں نظر آتی تھی !! یہ بات حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے پوچھیے ـــــ جنھوں نے اس کا منظر اس وقت دیکھا تھا جب وہ خوشبوؤں کی تجارت کرنے والے اپنے چچا کے ساتھ مکے میں آئے ہوئے تھے ـــــ اور پہلی بار انھیں حضرت محمدؐ کا دیدار نصیب ہوا تھا۔ ان کی قوم کے یہ تاجر حضرت عباسؓ سے چاہ زمزم پر کاروباری گفتگو کر رہے تھے کہ اچانک دیکھا گیا کہ "باب الصفا" سے ایک سُرخ و سفید انسان جس کے دانتوں میں موتیوں کی سی چمک تھی، سیاہ داڑھی اور سفید لباس کے ساتھ داخل ہوا۔ اُس کی داہنی جانب ایک لڑکا آکر کھڑا ہو گیا اور اس کے پیچھے ایک عورت جو پارسائی کی زندہ تصویر نظر آتی تھی اور یہ تینوں روحیں حجر اسود کے بوسے اور کعبے کے طواف کے بعد بت کے بجائے اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔

خوشبو کے کاروباریوں نے اس سجدۂ توحید اور نمازِ اتحاد کی خوشبو کا جھونکا محسوس کیا تو جھوم کر رہ گئے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے .... ؟" حیرت اور عقیدت میں ڈوبی آوازوں نے حضرت عباسؓ سے سوال کیا۔

"وہ چودھویں کے چاند کی طرح جگمگاتا ہوا چہرہ میرا بھتیجہ محمدؐ بن عبداللہ ہے۔ ـــــ وہ داہنی سمت کھڑا ہوا میرا دوسرا بھتیجہ علی ابن ابی طالب ہے ـــــ اور وہ پارسا خاتون محمدؐ کی بیوی خدیجہؓ ہیں۔" حضرت عباسؓ نے کہا۔

"اور یہ تین سو ساٹھ (۳۶۰) بتوں کے پجاریوں کے درمیان ایک ہی خدا اور ایک ہی خون کی دوہری پکار لگانے والا دین ہے جس کو اس کا پیغمبر محمدؐ بن عبداللہ گم شدہ ملّت ابراہیمی کے نام سے پیش کر رہا ہے۔ اس وقت اس دین میں یہی تین روحیں شامل ہیں اور بس۔"

سوال کرنے والے چہروں پر خوف و امید کے ملے جلے جذبات نمایاں ہوئے اور یہ تاریخی آواز ایک ساتھ سب کے ہونٹوں سے پہلا انقلابی دھماکہ بن کر بلند ہوئی۔

—— "نہیں نہیں تین روحیں نہیں ہیں یہ" —— یہ تو پوری دنیا میں زبردست انقلاب کی آمد آمد ہے ..... یہ تو ایک نئی دنیا کے نئے آسمان و زمین ہیں۔ نئے سورج چاند ستارے ہیں یہ لوگ !! .....

کیا آج ایک بار پھر ان تین روحوں سے جڑے ہوئے کروڑوں دلوں میں بھی دو تین دل اس بحر و بر میں فساد کی ماری ہوئی دنیا کو بدلنے کے لیے ایک نئی دنیا اور نئے انقلاب کا دھماکہ نہیں سنا سکتے ؟

ہو سکتا ہے کہ یہ کارگراں خدا بڑے بڑوں سے نہ لے اور ہو سکتا ہے کہ چند کمزور و ناتواں قبول کر لیے جائیں۔ یہ آواز بھی قلب علی کی دھڑکنوں میں صاف سنائی دے رہی ہے —— آہ یہ آواز !

مکے میں تین سالہ خفیہ دینی پرچار کا دور ختم ہو چکا تھا اور کوہ صفا سے پہلی کھلم کھلا تبلیغ کا صور پھونکا جا چکا تھا کہ خدا کے رسولؐ نے حضرت علیؓ سے کہا۔ "رزق کے نام پر سارے انسان جڑ جاتے ہیں۔ اے علی تم قریش کی دعوت کا انتظام کرو تاکہ اس سے آگے رزّاق کے نام پر بھی وحدت و اتحاد کی درد بھری پکار لگائی جا سکے۔"

اور —— پھر حضرت علیؓ کے زیر اہتمام سجائے گئے دعوتی دسترخوان پر جب قریش کا سربرآوردہ اور سرپھرا مجمع رزق جسمانی کے مزے لے چکا تو روحانی دعوت کی آواز بلند کرنے والے حضرت محمدؐ کھڑے ہو گئے۔ کھانے کھا کھا کر اپنے کھلانے والے کو بھولنے والوں کے سامنے وہ عجیب و غریب انسانی چہرہ دردِ دل کی تصویر بنا ہوا تھا جس کی اصلی غذا انسانیت کا غم تھا۔ غم کھانے اور آنسو پینے والے اس انسانؐ کی آواز بلند ہوئی تو در و دیوار تک اس کے ساتھ رو پڑے ——

"اے انسانو ! میرے پاس ایک سب سے قیمتی چیز اور بھی ہے جو اگر تمہارے ہاتھ آ جائے تو ساری دنیا اور اس کی دولت تمہارے قدم چوم لے گی ....."

"اچھا !" حاضرین محفل یہ سن کر چونک اُٹھے —— یہ اس ہستی کی آواز تھی

جس کی سچائی اور امانت کی چالیس سال سے پورا مکہ قسم کھاتا آیا تھا۔ "ایسی قیمتی چیز! ـــــ اسے تو ہم سب قبول کریں گے اے الامین، اے الصادق ـــــ بتاؤ وہ کیا ہے اور کہاں ہے؟"

ـــــ "وہ یہ رزق کھلانے والا رزّاق ہے ـــــ اللہ ہے ـــــ" داعیٔ دین پکار اٹھا۔ "وہی ـــــ صرف معبود ہو سکتا ہے، جو کھلاتا ہے کھاتا نہیں۔ سُلاتا ہے سوتا نہیں، موت دیتا ہے مرتا نہیں۔ کون اس پکار میں میرا ساتھ دیتا ہے۔ کون رزق دینے والے رزّاق کو بھی قبول کرتا ہے۔ اے لوگو!"

ساری محفل پر موت کی سی خاموشی چھا گئی ـــــ ایسا لگا کہ رزق سے جینے والے، رزّاق کا نام سنتے ہی مر گئے ہیں! صرف ایک دل تھا جو اس دردناک صورت حال پر تڑپ اٹھا ـــــ یہ بارہ تیرہ سالہ لڑکے حضرت علیؓ ہی کا دل تھا۔

"میں آپؐ کا ساتھ دوں گا! ـــــ میں!!" انسانیت کی اس موت پر فریاد کرتی ہوئی تنہا آواز بلند ہوئی ـــــ "اگرچہ میری آنکھیں دکھتی ہیں اور میری ٹانگیں پتلی پتلی ہیں۔"

اس کمزور و ناتواں کو اپنے سینے سے لگا لینے کے بعد پکارنے والے نے دوبارہ سہ بارہ وہی آواز بلند کی لیکن اس کے جواب کے لیے اس کمزور و ناتواں کے سوا کوئی دوسرا زندگی کا ثبوت نہ دے سکا۔

کل حضرت علیؓ کی دکھتی ہوئی آنکھوں میں ـــــ پتلی پتلی ٹانگوں میں خدا کی طاقت اس وقت آئی تھی جب وہ اپنی 'میں' کی کمزوریوں سے آزاد ہو گئے تھے۔ آہ! کس قدر آزاد!! ـــــ اگر کل یہ ممکن تھا کہ خدا اور خون کی دوہری ایکتا کی پکار بلند کرنے کے لیے تجربہ کار بڑھاپوں اور فولادی جوانیوں کے بجائے ایک کمزور و ناتواں منتخب اور قبول کیا جائے اور پھر اس کی انہیں دکھتی ہوئی آنکھوں سے اندھوں کے لیے بینائی اور مُردوں کے لیے زندگی تقسیم ہو اور اس کی پتلی پتلی ٹانگوں کی ٹھوکروں سے یہودیت کے آہنی و فولادی قلعے تہہ و بالا کر دیے جائیں

اگر کل یہ ممکن تھا تو کیا آج بھی ممکن ہے ؟ آج تفرقہ و خودی کی بارہ صدیوں کی آندھی حضرت محمدؐ اور حضرت علیؓ کے سوزِ دل سے جلائے ہوئے چراغوں کو اس درجہ گل کر چکی کہ ان دونوں سے ایک سی نسبت رکھنے والی طریقت و شریعت میں ٹکراؤ ہو رہا ہے اور شیعت اور سُنّیت صدیوں سے باہم دست و گریباں ہیں اور صحابیت و اہل بیت کا اصل صاحبؐ و سربراہ ایک بار پھر ویسی ہی فضاؤں میں روحانی پکار لگا رہا ہے۔ "خدا اور خون کی وحدت کی پکار بلند کرنے میں کون میرا ساتھ دیتا ہے۔" مقدس رشتوں کے سروں پر خدا دو نہیں ایک ہی تو ہے۔

کہاں ہیں وہ لوگ جو آج رسول رحمت و اتحاد کی روحانی پکار کا ایک بار پھر وہی جواب دے سکیں جو شیر خدا بن جانے والے اس کمزور اور ناتواں علی نے دیا تھا۔ آج قومیں ہمیں حدیث کی پیشین گوئی کے مطابق بین الاقوامی چوراہوں پر اس طرح کھا رہی ہیں جیسے بھوکے دسترخوان پر کھانوں پر جھپٹتے نظر آتے ہیں اور ان آدم خوروں سے دور بھاگنے کی طاقت بھی ہم میں نہیں ہے۔ کل اسلام کفر کی حالتِ زار پر رو سکتا تھا مگر آج کفر ہمارے اسلام پر ہنس رہا ہے ـــ کیا ہم مسلمان ہیں ؟

اب تلک یاد ہے قوموں کو حکایت اُن کی
نقش ہے صفحۂ ہستی پہ صداقت اُن کی

امین الامّت

حضرت ابو عبیدہ بن الجرّاح نے خدا کے محبوب دین کی کیسی کیسی خدمت کی!

اسلام کو انھوں نے اس وقت سینے سے لگایا تھا جب اسلام کی طرف بڑھنے کے معنی ساری دنیا جہان سے کٹ جانے کے تھے۔ خطرات طوفانی رفتار سے آگے بڑھ رہے تھے اور اسلام کی طرف پیش قدمی کرنے والوں کو پیچھے دھکیل دینے کی بے پناہ کوشش ہو رہی تھی۔ مگر یہ پیش قدمی کسی طرح رکتی نہ تھی۔ لوگ تھے کہ آخرت کا گھر بسانے کے لیے اپنی حیات دنیا کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کا ولولہ دکھا رہے تھے۔ اسی کاروان شوق میں حضرت ابو عبیدہؓ بھی شامل تھے جو اپنے دونوں ہاتھوں سے دنیا کو ہٹا ہٹا کر خدا کی سمت میں مصروف سفر تھے حق اور باطل میں گھمسان کا رن پڑ رہا تھا۔ اور اہل حق خون کی طغیانی میں ایمان کا سفینہ کھے رہے تھے۔ جس وقت جنگ بدر میں حق و باطل کے درمیان پہلی مسلّح کش مکش کا تاریخی بگل بجا اور حضرت ابو عبیدہ جہاد و عزیمت کے محاذ پر سر سے کفن باندھے ہوئے آئے تو دیکھا کہ ان کے مقابل میں جو شخص ننگی تلوار کھینچے ہوئے سامنے آکھڑا ہوا ہے وہ خود اُن کا "باپ" ہے۔ کافر باپ کا خون اگرچہ مومن بیٹے کے لیے سفید ہو چکا تھا مگر مومن بیٹے کی نظر میں وہ بہرحال اس کا باپ تھا۔ باپ کی کوشش تھی کہ خدا کے آگے جھکے ہوئے بیٹے کا سر اتار دے مگر بیٹے کی آرزو تھی کہ میری تلوار میرے باپ کی زندگی کو کفر پر ختم کرنے کا سبب نہ بنے تو اچھا ہے۔ اس مؤمنانہ احساس سے وہ حملہ آور کو طرح دیتے اور پہلو بچاتے رہے مگر جوں ہی ان کو محسوس ہوا کہ درحقیقت یہ ایک باپ کا حملہ بیٹے پر نہیں بلکہ ایک باغی بندے کا حملہ اپنے حقیقی خدا پر ہے تو بے اختیار حضرت ابو عبیدہؓ کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ پھر بجلی کی طرح لپک کر انھوں نے ایک ہی فیصلہ کن وار میں اپنے خدا

کے لیے اپنے باپ کی گردن صاف کر دی۔

جنگ احد میں حضرت ابو عبیدہؓ نے جب یہ دیکھا کہ کفر و شرک کے درندوں نے اللہ کے رسولؐ کو گھائل کر ڈالا ہے اور ان ہولناک حملوں کے نتیجے میں خود کی آہنی کڑیاں عارض رسالت میں گھس کر رہ گئیں ہیں تو حضورؐ کی یہ کیفیت ان سے ایک پل کے لیے بھی نہ دیکھی گئی وہ والہانہ درد کے عالم میں آگے بڑھے اور اپنے دانتوں سے ان کڑیوں کو باہر کھینچ لانا چاہا۔ یہ کڑیاں دھیرے دھیرے باہر نکل رہی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ اس سخت کوشش میں حضرت ابو عبیدہؓ کے دانت ٹوٹ رہے تھے اور منھ سے خون کی دھار چھوٹ رہی تھی۔ لیکن دانتوں کے پاش پاش ہونے کا جاں گسل درد اس خوشی کے احساس میں گم ہو کر رہ گیا تھا کہ حضورؐ کے نازک رخساران آہنی کڑیوں سے نجات پا چکے ہیں۔

یوں تو وہ ہر اس جگہ سینہ سپر دیکھے گئے جہاں کہیں اور جب کبھی اندھیروں نے اجالوں پر چڑھائی کی اور جھوٹ نے سچائی کو تباہ کر دینا چاہا۔ لیکن حضورؐ کی وفات کے فوراً ہی بعد سقیفہ بنی ساعدہ میں جب خلیفۂ اول کے انتخاب کا مسئلہ اٹھا تو یہ وقت تھا جہاں اللہ والوں کو اللہ کے لیے خود اپنے نفس سے جنگ — خوں ریز جنگ کرنا تھی۔ یہ وہ نازک گھڑی تھی جب منافقین حضورؐ کے ساتھ ساتھ اسلام کو بھی ہمیشہ کے لیے دفن کر دینے کی آخری چال کھیل رہے تھے۔ جہاں شیطانی سازش یہ تھی کہ قربانی کے دیوانوں کو حقوق طلب کرنے کی راہ سے مشتعل کر دیا جائے اور اس طرح ایمانی اخوت کی اس سدا بہار کھیتی کو جلا کر خاک کر دیا جائے جس کو ۲۳ سال تک خدا کے رسول نے اپنے خون اور آنسوؤں سے سینچا تھا۔ آج اسلام کی ہمیشہ مدد کرنے والے انصار اسلام سے اپنے لیے خلافت کا حق مانگ رہے تھے اور مہاجرین کا یہ دعویٰ تھا کہ اس کا حق انھیں ملنا چاہیے جنھوں نے اسلام کے لیے اپنا گھر بار اور سب کچھ سب سے پہلے چھوڑا تھا۔ یہاں حقوق کی بحث ایک بار پھر ایثار و قربانی کی آواز دے رہی تھی مگر جذبات کے زبردست

شور میں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ حقوق کی یہ طوفانی بحث کیا اب کسی طرح بھی آخری قربانی کی طرف موڑی جا سکے گی یا نہیں؟ ٹھیک اس وقت ایک درد بھری آواز آئی ــــ آخرت کے خوف اور امید سے کانپتی ہوئی آواز ــــ قربانی کے لیے بیتاب چیخ! ــــ سراپا سوز ــــ ہمہ تن کرب و درد! ــــ خدا کے لیے سب کچھ تج دینے کی نوائے دردناک؟

"اے انصار! تم وہ ہو جنھوں نے سب سے پہلے اسلام کی دست گیری کی، پس ایسے نہ بنو کہ تمھاری وجہ سے اسلام میں سب سے پہلی جماعتی پھوٹ پڑے....."

یہ حضرت ابو عبیدہ کی آواز تھی جہاں لوگوں کے کانوں میں خود اپنے دلوں کی صدا نہ آ رہی تھی وہاں یہ نوائے درد کام کر گئی، دل سے نکلی ہوئی پکار نے اللہ والوں کے دل ہلا دیے ــــ اختلافات کے خونیں بادل گرد کی طرح صاف ہو گئے جو انصار ابھی ابھی اپنا حق طلب کر رہے تھے۔ ان کے درمیان سے قربانی کے لیے بے تاب ایک بجلی سی چمکتی ہوئی نکلی یہ حضرت زیدؓ بن ثابت تھے جو تڑپ کر آگے بڑھے اور بیک جنبشِ زبان و دل اس خوفناک بحث کا خاتمہ کر دیا۔

"آں حضرتؐ مہاجر تھے اس لیے خلیفہ بھی مہاجر ہوگا اور ہم جس طرح آپؐ کے انصار تھے اسی طرح آپؐ کے خلیفہ کے انصار رہیں گے۔"

"دیکھو!" اس عظیم جذباتی موڑ پر حضرت صدیق اکبرؓ نے کھڑے ہو کر منصفانہ اعلان کیا۔ "یہ عمرؓ ابن خطاب ہیں جن کے بارے میں آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا تھا کہ ان کی برکت سے خدا نے اسلام کو چار چاند لگائے اور یہ ابو عبیدہ بن الجراحؓ ہیں جن کو رسولِ خدا کی بارگاہ عالی سے "امین الامت" کا خطاب عطا ہوا۔ آؤ اور ان میں سے جس کے ہاتھ پر چاہو بیعت کر لو۔"

یہ اعلان اس بات کا ثبوت تھا کہ اسلام کی سب سے بڑی خدمات انجام دینے والا اسلام کے لیے سب سے بڑی قربانی پیش کر رہا ہے اور سچائی کو سب سے پہلے قبول

کرنے والا سب سے پہلے اپنے حق خدمت سے اس طرح دست بردار ہو رہا ہے کہ وہ
بھی جان سے خود کو دوسروں کی ماتحتی میں دینے کے لیے تیار ہے۔ ساتھ ہی یہ اعلان اس
بات کا نشان دار موقع تھا کہ حضرت عمرؓ ہوں یا حضرت ابو عبیدہؓ دونوں اپنی اپنی جاں
نثاریوں کے صلے میں خلافت کا اعزاز حاصل کر سکتے ہیں۔ مگر وہاں دنیا نے یہ منظر دیکھا
کہ خلافت کے لیے نامزد ہوتے ہی حضرت عمر فاروقؓ بیتابانہ اٹھے اور حضرت ابو بکرؓ کے
ہاتھ پر بیعت کرتے ہوئے یہ اعلان شوق کیا۔

"آہ! اے رفیق غار! آپ کے ہوتے ہوئے اور کون دوسرا اس کا حق دار ہو سکتا
ہے .....؟"

اُدھر حضرت ابو عبیدہؓ کا یہ عالم ہوا کہ مجمع کو چیرتے پھاڑتے یہ کہتے ہوئے تیر کی طرح
جھپٹ رہے تھے۔

"دیکھو پہلے میں بیعت کروں گا ــــ دیکھو پہلے میں ....."

لاذقیہ کی فتح کے بعد سپہ سالار اسلام حضرت ابو عبیدہؓ کو پتہ چلا کہ قیصر روم ایک بڑی
دل فوج کے ساتھ مسلمانوں پر ٹوٹ پڑنا چاہتا ہے۔ مسلمانوں کو ان کا مقابلہ کرنے کے لیے
آگے بڑھنا تھا مگر بڑی دقت یہ تھی کہ مسلمانوں کے ساتھ ایک بڑی تعداد عورتوں کی تھی
اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان کو کہاں چھوڑا جائے۔

"لاذقیہ میں ان کو چھوڑ دیا جائے۔" کسی نے رائے دی۔

"نہیں" دوسرے نے اختلاف کیا۔ "یہ مناسب نہیں کہ عیسائیوں کے اس شہر میں
ہم عورتوں کو چھوڑ کر آگے بڑھ جائیں"۔ پھر کیا کیا جائے؟

سب لوگ سوچ میں تھے۔ اب تیسری شکل یہی ہو سکتی تھی کہ اس بستی کو بالکل
سے خالی کرا دیا جائے تاکہ وہاں مسلمان عورتوں کے لیے ان سے خطرہ نہ رہے۔ نہایت
سادہ لوحی کے ساتھ یہی تجویز حضرت ابو عبیدہؓ کی زبان پر آ گئی۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" ایک لشکری نے سپہ سالار پر قدرے گرم ہوتے ہوئے کہا
"ہم ان عیسائیوں کو امن کے لیے زبان دے چکے ہیں کیسے ممکن ہے کہ ہم اس مجبوری کے

تحت اپنی بات سے پھر جائیں۔"

اگرچہ عورتوں کی حفاظت کے مسئلے نے یہاں اضطرار کی سی شکل اختیار کر لی تھی اور اس اضطراری حل کے خلاف ایک معمولی سپاہی سپہ سالار کے سامنے بول پڑا تھا لیکن حضرت ابو عبیدہؓ کے سامنے اس وقت نہ ضرورت کا اضطرار تھا اور نہ سپاہی کا معمولی ہونا۔ وہ محسوس کر رہے تھے کہ کہنے والے نے ایک بھاری بات کہی ہے جو حق ہے۔ ایک منٹ بھی کسی تاویل پر ضائع کیے بغیر وہ فوراً اس بات کے آگے عاجزانہ جھک گئے اور بڑی ندامت و تشکر کے ساتھ بولے۔

"بے شک میں ہی غلطی پر تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جن عیسائیوں کو ہم نے وعدۂ امن دے دیا ہے اب اپنے اس وعدے سے پھر جائیں واقعی یہ میری غلطی تھی۔"

جنگ یرموک کی تیاریاں کرنے میں سپہ سالاری کی عظیم پوزیشن میں حضرت ابو عبیدہؓ ہمہ تن مصروف تھے۔ اتنے میں حضرت خالدؓ ان کی خدمت میں پہنچے۔

"اگر آپ" حضرت خالدؓ نے عرض کیا "تمام فوجوں کی کمان میرے ہاتھ میں دے دیں اور فوج کو حکم جاری کر دیں کہ وہ میری پوری پوری اطاعت کرے گی تو مجھے امید ہے کہ ہم فتح یاب ہو جائیں گے۔"

اسلامی فتح کی محض ایک امید دلائی جا رہی تھی اور اس امید کی قیمت یہ تھی کہ انتہائی تجربہ کار سپہ سالار سپہ سالاری کے اعزاز سے دست برداری دے دے۔ اس وقت حضرت ابو عبیدہؓ کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ فتح کا نقشہ بنانے کے لیے میں کسی سے کم نہیں ہوں۔ کسی قسم کا پس و پیش کیے بغیر انھوں نے اسلام کی فتح کی "امید" کو سینے سے لگا لیا اور سپہ سالاری کا تمام اعزاز ہاتھوں ہاتھ پیش کر دیا۔ حضرت خالدؓ جس خلوص سے یہ "اعزاز" طلب کر رہے تھے اُسی خلوص سے حضرت ابو عبیدہؓ یہ اعزاز چھوڑ رہے تھے۔ دلوں کا یہ خلوص خدا کے فضل سے رومیوں کی ٹڈی دل فوجوں پر بھاری ثابت ہوا۔ دو دلوں کی دھڑکنوں کے آگے آہن و فولاد میں

ڈوبی ہوئی رومی فوجیں نہ ٹھیر سکیں۔ میدانِ جنگ میں اپنے سپاہیوں کی لاکھوں لاشوں کو روندتی ہوئیں یہ فوجیں الٹے پاؤں بھاگ رہی تھیں اور خدا کے یہ دونوں نیک دل بندے ادائے شکر سے مسکرا رہے تھے۔

قبیلہ قضاعہ کی تادیب و سرکوبی کے لیے تین سو مجاہدین کا دستہ حضرت عمروؓ بن العاص کی سرکردگی میں روانہ کیا گیا تھا اس کے بعد جو کمک بھیجی گئی اس کے سپہ سالار حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح بنائے گئے۔ یہ بڑی عزت افزائی کی بات تھی کہ اس امدادی دستے میں شیخین جیسی ہستیاں بھی حضرت ابو عبیدہؓ کے پیچھے چل رہی تھیں لیکن جب یہ فوج محاذ پر پہنچی تو حضرت ابو عبیدہؓ کو ان کے خدا نے آزمایا۔ حضرت عمروؓ ابن العاص نے کہا:

"آپ لوگ میری مدد کے لیے بھیجے گئے ہیں اس لیے ساری فوج کی کمان میرے ہی ہاتھ میں رہے گی۔"

"بے شک" حضرت امین الامت نے ارشاد فرمایا: "آپ جس فوج کے افسر ہیں اس کے افسر رہیں گے لیکن یہ امدادی دستہ میری ہی ذمہ داری اور میری ہی کمان میں بھیجا گیا ہے اس لیے آپ اپنی جگہ افسر رہیں اور میں اس امدادی دستے کا نگراں رہوں۔"

لیکن حضرت عمرو بن العاصؓ نے یہ بات نہیں مانی۔ قریب تھا کہ اختلاف رائے جھگڑے کی شکل اختیار کرلے کہ اچانک حضرت ابو عبیدہؓ نے اپنی تمام بزرگی اور منزلت کے باوجود بخوشی ہتھیار ڈال دیئے اور سپہ سالاری کی جگہ سے چپکے سے ہٹ کر ماتحتی میں کام کرنے کو تیار ہو گئے۔

فتوحات کی عظیم الشان کثرت کے بعد جب ہر طرف دولت کی ریل پیل ہو رہی تھی اور قدرتی طور پر لباس اور کھانے پینے میں مسلمانوں کا معیار زندگی اونچا ہو رہا تھا اس وقت حضرت ابو عبیدہؓ جو فاتح شام تھے روٹی کے سوکھے ٹکڑے پانی میں

بھگو بھگو کر کھا رہے تھے۔ سفرِ بیت المقدس کے موقع پر حضرت عمر فاروق رضؓ نے حضرت ابو عبیدہؓ سے از راہ خوش طبعی و بے تکلفی کہا:

"بھئی آج تو ہماری دعوت کر دو نا!"

ایک لمحے کے لیے انھوں نے کچھ سوچا۔ سوچ یہی تھی کہ خلیفۂ وقت کے سامنے اپنا موٹا جھوٹا کھانا لانا مناسب ہے کہ نہیں۔ آخر اندر گئے، اور وہی روٹی کے سوکھے ٹکڑے پیش کرتے ہوئے معذرت چاہی کہ:

"میری تو یہی خوراک ہے۔ روٹی کے یہ ٹکڑے سوکھے ہوئے ہیں مگر پانی میں تر کر کے ان کو درست کھا لیا کرتا ہوں۔" عقیدت و احترام فقر سے حضرت فاروق رضؓ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ فقر کا دلدادہ فقر کے دلدادے کو رشک کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔

"اے ابو عبیدہؓ!" انھوں نے آہ سرد کھینچتے ہوئے کہا۔ "شام میں آکر سب ہی بدل گئے مگر ایک تم ہو کہ اپنی اُسی وضع پر قائم ہو!"

فلسطین کے مشہور شہر عمواس میں طاعون کی وبا پھوٹی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس وبا نے شام، مصر اور عراق کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ہزارہا انسان موت کے گھاٹ اُتر رہے تھے اور ٹھیک اسی خطرناک علاقے میں حضرت ابو عبیدہؓ اطمینان سے فروکش تھے تقدیر پر ان کا ایمان "شدید" تھا اور اس شدت میں ایسے خطرات سے بچتے ہوئے بھی ڈرتے تھے کہ کہیں تقدیر پر ایمان کی خلاف ورزی نہ ہو جائے۔ حضرت عمر فاروق رضؓ کو یہ خطرناک حالات معلوم ہوئے تو حالات کا معائنہ کرنے کے لیے موقع پر تشریف لائے اور بڑی التجا کے ساتھ حضرت ابو عبیدہؓ سے کہا کہ اس مقام سے دور چلیے۔

"کیا تقدیر سے بھاگتے ہو؟" بندۂ مومن نے جوشِ ایمان میں پلٹ کر جواب دیا۔

"ہاں ـــــ خدا کی تقدیر سے خدا کی تقدیر ہی کی طرف بھاگتا ہوں۔"

حضرت عمر فاروق رضؓ نے حکمت کے ساتھ جواب دیا۔

مگر یہ بات حضرت ابو عبیدہؓ کے دل کو نہ لگی اور وبائی علاقہ سے جان بچا کر

جانا ان کو تقدیر پر ایمان کے خلاف محسوس ہوا۔ حضرت عمرؓ تڑپ رہے تھے کہ اجتہادی خطا کی بدولت ایک بڑی قیمتی جان خطرے میں ہے۔ مگر پاس ادب سے کچھ نہ کہہ سکے اور بڑے اضطراب کے عالم میں واپس مدینہ تشریف لائے۔ ہر وقت ان کا دل حضرت ابو عبیدہؓ میں اٹکا ہوا تھا آخر ایک تدبیر سوچی اور ان کو خط لکھا کہ آپ سے مجھے ایک کام ہے اس لیے ذرا مدینے ہو جایئے۔ حضرت ابو عبیدہؓ مطلب سمجھ گئے، اس لیے اس خط کا جواب یہ پہنچا کہ:

"میں اسلامی لشکر کو یہاں چھوڑ کر محض اپنی جان بچانے کے لیے تمھارے پاس نہیں آسکتا جو کچھ خدا کو منظور ہے وہ تو ہو کر ہی رہے گا۔"

یہ خط پڑھ کر بے چارگی کے ساتھ حضرت عمرؓ رو پڑے۔ آخر مجبور ہو کر انھوں نے یہ درخواست کی کہ اسی علاقہ میں کسی بہتر مقام پر منتقل ہو جایئے اور لشکر کو بھی ساتھ لے جایئے۔ یہ بات حضرت ابو عبیدہؓ نے مان لی۔ لیکن دوسرے مقام پر پہنچتے ہی اُن پر طاعون کا حملہ ہو گیا اور ہنسی خوشی امین الامت زندگی کی امانت سے سبکدوش ہو گئے اس خبر کو پا کر حضرت عمر فاروقؓ پھوٹ پھوٹ کر روئے اور فرمایا کہ حضورؐ اور حضرت صدیق اکبرؓ کے بعد یہ میری زندگی کا سب سے بڑا صدمہ ہے۔

کتنا بلند و بالا تھا وہ انسان جس کے متعلق حضرت عمر فاروقؓ یہ کہا کرتے تھے کہ "اگر میری موت کے وقت تک ابو عبیدہؓ زندہ رہے تو میں خلافت کے لیے ان کو نامزد کروں گا اور خدا سے عرض کر دوں گا کہ تیرے رسولؐ نے جس شخص کو امین الامت قرار دیا تھا، خلافت کی امانت میں اسی کو سونپ آیا ہوں۔"

یہ اُس آدمی کے الفاظ تھے جو اپنے بعد کسی کو خلافت کے لیے نامزد کرنے کے خیال ہی سے لرزتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے اعمال کی ذمہ داری اور جواب دہی میرے حصہ میں آجائے۔ یہ اس شخص کے الفاظ تھے جس نے اپنی اولاد پر بھی خلافت کے منصب کا حق ادا کرنے کا اعتبار نہ کیا تھا اور یہ وصیت چھوڑی تھی کہ "جس کو چاہو منتخب کرو مگر خلافت کا کوئی حق آلِ عمرؓ کے لیے نہیں ہے۔"

دیکھو! یہ حق میں نے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا ہے ۔ ہاں وہی شخص اس کی آرزو رکھتا تھا کہ کاش اپنے بعد خلافت کے لیے میں ابو عبیدہؓ بن الجراح کو نامزد کرتا۔! کیسے خوش نصیب تھے ابو عبیدہؓ کہ جنھوں نے خدا کے دین کو سربلند کرنے کے لیے اپنے آپ کو خاک میں ملا دیا۔ فوجیوں کے کمانڈر تھے مگر خدا کی زمین پر کیسے ڈرتے ڈرتے چلتے تھے۔ جو فاتح شام تھے مگر اپنی فتوحات کے عہد زریں میں سوکھی روٹی کے ٹکڑے کھا کھا کر خدا کے وعدۂ جنت پر جی سے راضی تھے۔ آزمائش کی یہ کڑی منزلیں سر ہو گئیں اور ان کا تمام دکھ درد تاریخ میں رہ گیا مگر ان مجاہدات کا لافانی انعام انشاء اللہ ہمیشہ ان کے ساتھ رہے گا ۔۔۔ کتنی معقول اور کس قدر پر معنی تھی ان کی خوشی جو دائمی سکون کے انتظار میں دنیا کے عارضی دکھ جھیل رہے تھے لیکن خدا جانے کتنی بڑی تباہی ہے ان کے لیے جن کے لیے عیش و عشرت بس ہے ۔۔۔ خواہ آخرت یکسر تباہ ہو کر رہ جائے!! جو چار دن کی چاندنی پر مگن ہیں مگر ذرا فکر نہیں کہ کہیں قبر میں گھپ اندھیرا نہ پڑا رہ جائے۔

اے مسلماں اپنے دل سے پوچھ مُلّا سے نہ پوچھ
ہو گیا اللہ کے بندوں سے کیوں خالی حرم؟

نقوشِ دوام

غیرتِ حق بھی کیا چیز ہے جو ایک معصوم بچے کے سینے میں بھی جوانی کی آگ بھر دیتی ہے؟

زبیرؓ بن العوام اس وقت محض ایک کم سن لڑکے ہی تھے جب مکہ میں یہ زلزلہ خیز افواہ اڑی کہ مشرکوں نے آج تو خدا کے رسولؐ کو گرفتار کر لیا ہے! — یہ خبر سب نے سنی — جوانوں نے بھی سنی — بوڑھوں نے بھی اس افواہ کو سنا، مگر غیرتِ حق کے آتش کدہ سے جس ننھی سی چنگاری نے سب سے پہلے گھور اندھیارے پر جست کی وہ خدا کی قسم ایک بچہ تھا — ایک طفلک سادہ معصوم! — زبیرؓ، عوام کا بیٹا زبیرؓ!

رگوں میں کھولتا ہوا خون بے تاب تھا کہ رگ رگ سے ٹپک پڑے — ہاتھوں میں سونتی ہوئی ننگی تلوار نیم بسمل کی طرح بے چین تھی کہ جن ناپاک ہاتھوں نے دامنِ رسالتؐ کو چھونے کی گستاخانہ جسارت کی ہے ان کو جسم سے جدا کر دے — اسی حال میں یہ بچہ ایک خطرناک فیصلے کے ساتھ مکہ کے گلی کوچوں سے آندھی کی طرح گزرا اور آستانۂ رسالتؐ پر تحقیق حال کے لیے آواز بلند کی۔ وہاں اس نے نہ جانے کس حال میں یہ دیکھا کہ محمد عربیؐ اس کے سامنے ہیں! محمد عربیؐ جن کے سوزِ دروں نے عرب اور عجم کے ناپید اکنار فاصلوں پر بچھڑی ہوئی انسانیت کو گلے ملا دیا! محمد عربیؐ جن کا نام لیتے ہوئے دل تڑپ کر ہونٹوں پر آتا ہے — محمد عربیؐ! جن کو دیکھ کر ساری کائنات بھول جاتی تھی اور انسان کو اپنا خدائے واحد یاد آتا تھا۔ زبیرؓ نے یہ منظر دیکھا اور اس کا سارا خروشِ انتقام آنسوؤں کی شکل میں آنکھوں سے رواں ہو گیا۔ ایک بچہ مسرت کی شدت میں بچوں ہی کی طرح رو پڑا تھا۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم عظیم ترین شفقت اور حیرت کے ساتھ اس کو سینے سے لگانے کے لیے آگے بڑھے :

"اے زبیرؓ! ـــــ یہ کیا!"

"جی؟" دوسری طرف سے آنسوؤں میں بھیگی ہوئی آواز آئی :

"میں نے سنا تھا کہ خدانخواستہ آپؐ کو گرفتار کر لیا گیا ہے ..... آپؐ کو....."

زبیرؓ نہ جانے کیا کہنا چاہتے تھے جس کو مسرت کی ہچکیوں نے کہا الفاظ نے نہیں! مگر خدا کے رسولؐ نے سب کچھ سمجھ لیا ـــــ آپؐ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ ہانپتا ہوا تنفس اب بھی بتا رہا تھا کہ ابھی ابھی اس معصوم بچّے کے سینے پر کتنا بڑا طوفانِ غیرت گزر چکا ہے ننگی تلوار اب بھی کہہ رہی تھی کہ نکلنے والا کس ارادہ سے نکلا تھا ـــــ لیکن شفاف آنکھوں سے جھلکتے ہوئے موتی اس حقیقت کا اعلان کر رہے تھے کہ یہ ایک بچہ ہے ـــــ محض ایک معصوم و کمزور بچّہ! آپ کے ہاتھ بے ساختہ دعا کے لیے پھیل گئے ـــــ پیغمبرؐ کا دل خدا جانے اپنے خدا سے بچّے کے لیے کیا کچھ مانگ رہا تھا جس کے ہاتھوں اسلام کے نام پر سب سے پہلی تلوار بے نیام ہوئی۔

اسلام! ـــــ جس کے لیے سب سے پہلے ایک بوڑھی سمیّہؓ نے جان دی!

اسلام! ـــــ جس کے لیے سب سے پہلے ایک معصوم زبیرؓ نے تلوار اٹھائی۔!

یہی بچّہ جب سچ مچ جوان ہوا تو فرشتے اس کے نقشِ قدم پر چلے! معرکۂ بدر میں جب اسلام کا یہ سپاہی زرد رنگ کا عمامہ باندھے ولولۂ شہادت سے تڑپتا ہوا نکلا تو امین و صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :ـ

"زبیرؓ کو دیکھ لو! آج ٹھیک اسی لباس میں فرشتوں کے لشکر ہیں۔"

یہی وہ محاذ جنگ و جہاد تھا جہاں لوہے کی تلوار تھک کر خم کھا گئی، مگر مجاہد زخم شہادت کی دھن میں کسی طرح نہ تھکتا تھا ـــــ آخر اس کی پُر شوق آرزو پوری ہوئی ـــــ اس لیے ایک ایسا بھی کاری زخم کھایا جس کا خشک گہرا گھاؤ اس کے کفن میں اس کے ساتھ گیا ـــــ عروہ بن زبیرؓ کا بیان ہے کہ یہ گھاؤ کا نشان تمام

عمرؓ ان کے باپ کے جسم پر ایک عظیم یادگار کی طرح قائم رہا۔

عمر بھر تقدیر ان پر ہُن لٹاتی رہی مگر عمر بھر ان کی زندگی میں فقیروں کی سادگی قائم رہی ـــــ ان کے ایک ہزار غلام جب دن بھر کی محنت کا حاصل ایک بھاری بھرکم رقم کی شکل میں ان کے سامنے لاکر ڈھیر کر دیتے تو معاً یہ خیال آپ کی روح کو جھنجھوڑ ڈالتا کہ،

یہ سب لوگ اپنے خون پسینے کی گاڑھی کمائی میرے سامنے لاکر ڈھیر کر دیتے ہیں صرف اس لیے کہ یہ میرے غلام ہیں۔ جب غلامی کا تقاضا یہ ہے تو پھر عبودیت کیا کہتی ہے؟ ـــــ اس غلام کو کیا کرنا ہوگا جو خدا کا غلام بھی ہے اور اس کی مخلوق بھی؟"

ان خیالات کے ساتھ آپ کی نظر اس چمکتے دمکتے ڈھیر سے ہٹ جاتی اور آپ دونوں ہاتھوں سے اس کی پائی پائی اپنے معبود کی راہ میں لٹا دیتے۔

اس انفاق کی کیفیت کا اندازہ دنیا کو اس وقت ہوا جب جنگِ جمل پر جاتے ہوئے آپ نے اپنے صاحبزادے عبداللہؓ سے کہا:

"لختِ جگر! مجھے سب سے زیادہ فکر اپنے قرض کا ہے۔ بائیس[۲۲] لاکھ کی یہ امانتیں جو بطور قرض لی گئیں اور بطور قرض خرچ ہوئیں۔ میری املاک فروخت کر کے ادا کر دی جائیں۔ اس میں سے ایک تہائی خاص تمھارے بچوں کے لیے وصیت کرتا ہوں۔ اگر مال پھر بھی ناکافی ثابت ہو تو پھر میرے مولا کی طرف رجوع کرنا۔"

"مولا؟" صاحب زادے نے پوچھا۔

"آپ کا مولا کون ہے ابا جی؟"

جذب و شوق سے کپکپاتی ہوئی آواز آئی:

"میرا مولا ـــــ میرا خدا! ـــــ میرا خدا جس نے ہر آڑے وقت میں میری مدد فرمائی۔"

بنو قریظہ نے مسلمانوں کے ساتھ عہد شکنی کا ارتکاب کیا تو تحقیق حال کے لیے ایک

اپنے شوہر کی یہ بات سنی، لیکن ایک حرفِ تعجب بھی منہ سے نہ نکلا۔ طلحہؓ کی یہ عجیب و غریب پریشانی سعدیؓ کی نظر میں بھی بڑے فکر کی بات تھی۔ وہ محسوس کرتی تھیں کہ "اس سے بڑا بدنصیب کون ہوگا جس کے ہاتھوں میں تو سب کچھ ہو مگر دل میں کچھ بھی نہیں!۔ جو دنیا کو سب کچھ دے جائے اور ساتھ کچھ نہ لے جائے! ـــــ جو انسانوں کے درمیان خوش حال رہا ہو، مگر جب خدا کے حضور حاضر ہو تو اس کو بھوکے ننگے بھکاریوں کی صف میں جگہ دی جائے!!

"آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں؟" سعدیؓ نے محبت بھرا دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

"سیدھا سادہ علاج ہے اس کا! روپیہ نکالیئے اور راہِ مولا میں لٹا دیجئے۔!"

اور طلحہؓ نے یہ الفاظ سنے تو بچوں کی طرح خوشی سے کھل گئے خدا کی راہ میں لٹا دینے کے تصور نے دولت کو سچ مچ ایک قیمتی خزانے میں ڈھال دیا۔ جس کی امانت ہے اسی کے حوالے کر دینے کا خیال دل کا سارا بوجھ ہلکا کر گیا۔ دولت کا قیمتی ڈھیر ـــــ پورے چار لاکھ دینار! ـــــ مگر اس مردِ مومن اور مومنہ کو پورا یقین تھا کہ خدا کی جنت اس سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔

چار لاکھ دینار کا خزانہ بے دریغ لٹنا شروع ہوا ـــــ بنو تمیم کے یتیموں نے اس دولت سے اپنے دامن بھرتے ہوئے سوچا کہ اسلامی معاشرے کی آغوش میں ان کے باپ کی شفقت پوری قوت سے زندہ ہے ـــــ بیواؤں نے اپنے سہاگ کے جشن منعقد ہوتے ہوئے دیکھے اور قرض کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسانوں نے ایک بار پھر خدا کی زمین پر آزادی کا سانس لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے طلحہؓ نے چار لاکھ دینار خدا کی راہ میں لٹا دیئے۔ اپنے گرد و پیش کی دنیا کو خوش حال بنانے کے بعد وہ خود خالی ہاتھ کھڑے ہوئے تھے ـــــ مگر اب اُن کی روحانی پریشانی ختم ہو چکی تھی ـــــ اب ان کے ہونٹوں پر ایک لافانی مسکراہٹ کا نور تھا۔ ہاں اب ان کے ہاتھوں کی دولت ان کے دل کی گہرائیوں میں ہمیشہ کے لیے سما گئی تھی ـــــ اب وہ اس طرح خوش و خرم اپنے گھر لوٹ رہے تھے جیسے کسی خوف ناک جنگل میں بھٹکنے والا پریشان راہی خطرات

کی تاریکی سے نکل کر گھر کی راہ پر آ لگا ہو۔

ایک بار پھر یہی طلحہؓ سوگ میں ڈوبے ہوئے کھڑے تھے!

عمر ابن خطابؓ کا ادھر سے گزر ہوا۔ وہ چلتے چلتے رُک گئے اور ان کی پریشانی دُور کرنے کے لیے نفسیاتی زندہ دلی کا اندازہ اختیار کرتے ہوئے فرمایا ــــ

"طلحہؓ! خیر تو ہے؟ کیا کسی سے لڑ گئے ہو؟"

"نہیں!" پریشانی سے تھکی ہوئی آواز طلحہؓ کے خشک ہونٹوں پر سسک گئی۔

"پھر کیا بات ہے آخر؟"

دلگیر آواز میں جواب ملا ــــ "اے عمرؓ! ــــ میں خدا کے رسولؐ کی ایک قیمتی بات بھول گیا ہوں۔ آپؐ نے کچھ الفاظ بیان فرمائے تھے اور کہا تھا کہ موت کی گود میں دم توڑتی ہوئی زبان ان الفاظ کو ادا کرے گی تو جاں کنی کا کرب دور ہو جائے گا اور چہرے پر طمانیت کی شگفتگی پھیل جائے گی ــــ میں نے ان الفاظ کو یاد کیا تھا مگر حیف ہے مجھ پر کہ اب ..... اب وہ الفاظ مجھے کسی طرح یاد نہیں آ رہے!"

حضرت عمرؓ نے مردِ مومن کے جذباتِ غم کی شدّت کو رشک اور مسرت کے ساتھ محسوس کیا اور بولے "کیا خدا کے رسولؐ نے ہمیں لاالٰہ الّا اللہ سے بھی بہتر کوئی کلمہ سکھایا تھا؟"

طلحہؓ یہ سن کر خوشی سے اُچھل پڑے ــــ "قسم ہے خدا کی! ــــ یہی تھے وہ الفاظ! ــــ بالکل یہی!!"

کیسی حسین ہوگی وہ دنیا جس میں طلحہؓ جیسے مرد اور سُعدیٰؓ جیسی عورتیں آباد تھیں! ــــ ہاں وہ مسلمان تھے ــــ اور ہم بھی مسلمان ہیں ــــ مگر فرق صرف یہ ہے کہ جہاں ہماری خوشی کی انتہا ہوتی ہے وہاں سے ان کا غم شروع ہوتا تھا! ــــ پھر ان کی خوشی کون سی خوشی تھی؟ کون ہے جو

لیکن ـــــ آج ان کی زندگی کے چند لمحات ایمانی نہ جانے کیا شے بن گئے تھے کہ چند پلوں نے انیس سالہ زندگی کی ساری بنیادیں ہلا ڈالی تھیں۔ شاید اس لیے کہ انیس سال تک وہ صرف اس عورت کو جانتے تھے جس نے ان کو اپنی کوکھ سے جنم دیا تھا لیکن آج زندگی کے ان چند انقلاب انگیز لمحوں نے ان کو اس وحدہٗ لاشریک خالق تک پہنچا دیا تھا جس کی عظیم ترین قدرت کے نادیدہ ہاتھوں نے رحم مادر کی تاریک تنہائیوں میں باپ کے ایک قطرۂ ناپاک سے انسان جیسی مقدس مخلوق ڈھال کر دکھائی۔ وہ آج اس آب حیات کے چشمہ کو پا چکے تھے جس کے آگے ماں کی ساری مامتا شبنم کی ایک حقیر بوند سے بھی زیادہ حقیر و بے مایہ ہے۔

سعدؓ! ـــــ ہائے ہائے سعدؓ!! ـــــ " سعدؓ نے دیکھا کہ ان کی کافرہ ماں خون دل میں نہائی ہوئی سینہ پیٹ رہی اور سر کے بال نوچے ڈالتی ہے۔ چیخ رہی، بلک رہی اور چلا رہی ہے۔ " سعد! ـــــ ہائے سعد!! ـــــ تو بے دین ہو گیا! میں بھی ..... دیکھتی ہوں ..... کہ ..... تو ..... کیسے جاتا ہے محمدؐ کے پاس! ..... مجھ پر بھی کھانا پینا حرام ہے اگر تو نے اس کے نئے دین کو نہ چھوڑا! ـــــ ہاں ـــــ دیکھتی ہوں تو کیسے جاتا ہے وہاں! ـــــ جائے گا تو تجھے اپنی دکھیارن ماں کی لاش کو روندتے ہوئے جانا ہوگا ـــــ جان دے دوں گی مگر تجھے یوں بے دین نہ ہونے دوں گی۔"

یہ منظر دیکھ کر سعدؓ ابن وقاص کا دل ہل جانا چاہیئے تھا ـــــ لیکن دل اس طرح ہلا کر ایمان و یقین کے پاؤں کچھ اور جم گئے! قربانی کی خوں چکاں چوٹ کھا کر ان کے سینے سے خون کا سرخ سرخ فوارہ پھوٹا اور ایمان کے نوخیز پودے کو کچھ اور تر و تازہ کر گیا۔ وہ سر جھکائے سب کچھ سنتے رہے ـــــ سر اٹھا تو آنکھیں غیرت توحید سے سرخ گلنار آنکھیں مامتا کے وجود کو چیرتی ہوئیں سیدھی اپنے خدا تک چلی گئیں۔ ان آنکھوں میں آج ایک نئی ـــــ بالکل انوکھی "نظر" تھی جس کو نہ ماں جان سکی اور جو نہ ماں کو پہچان سکی! ـــــ ایک نظر ـــــ سراپا نور ـــــ نور ہی کی متلاشی ـــــ ظلمت سے بے نیاز ـــــ تاریکیوں سے گریزاں ـــــ خواہ یہ تاریکی ایک

چاہنے والی ماں کا دل دوز روپ دھار کر کیوں نہ آ کھڑی ہو! ــــ

یہ نظر اُٹھی تو ایمان کی روحانی دھڑکنوں سے گوشت پوست کا شیش محل تھرتھرا اٹھا ــــ سعدؓ کی جذبات سے بوجھل آواز یوں سنائی دے رہی تھی ــ

"ماں! ــــ تو اس بیٹے کو تو خوب پہچانتی ہے جس کو تو نے جنا ہے اور اتنے بڑے خالق کو ذرا نہیں پہچانتی جس نے تجھے بھی پیدا کیا اور مجھے بھی!! ــــ میری نادان ماں! ــــ دیکھ تو سہی! میں نے کیسا پیارا فیصلہ کیا ہے جو مجھے تجھ سے بھی زیادہ پیارا ہے ــــ آہ تو نہیں جانتی کہ وہ انسان جس کا نام محمدؐ ہے اس کو دیکھ کر دل کیوں پکار اٹھتا ہے کہ آپ پر میری ماں نثار ــــ میرا باپ قربان اور میری جان بھی! ــــ"

تین دن تک خون اور ایمان کے درمیان جنگ برپا رہی ــــ مامتا اور بندگی کے دو جذبے پوری قوت سے ٹکراتے رہے ــــ تین دن تک سعدؓ کی ماں بے آب و دانہ پڑی ہوئی سعدؓ کو پکارتی رہی ــــ بھوک پیاس کے جبڑوں میں پستی ہوئی مامتا کی جگر خراش پکار رہ رہ کر ڈوبتی ابھرتی رہی، لیکن ــــ ہر بار سعدؓ کے ہونٹوں سے خونِ حیات میں بھیگی ہوئی اور آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی یہی صدائے بازگشت بلند ہوتی رہی کہ "میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ــــ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ خدا کے بندے اور پیغمبر ہیں۔"

کیسا ہوگا وہ آدمی جس کا دل کچھ اس طرح دھڑکا کہ اپنے خون کے دھاروں کا رُخ پلٹ کر رکھ دیا ــــ وہ اس نئے رُخ پر چلا تو پیچھے ہٹنا تو کیسا پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ کیسا فلک بوس تھا یہ جذبۂ صداقت کہ اس کو خدائے کائنات نے محمدؐ کے مقدس سینے پر وحی بنا کر اُتارا ــــ قرآن کی آیتیں عرش کی بلندیوں سے چلیں تاکہ فرش زمین پر اُتر کر خون اور ایمان کے جہاد میں سر دھڑ کی بازی لگا دینے والے سعدؓ کی پشت پناہی کریں۔

وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِىْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا

___ اگر وہ دونوں (ماں باپ) یہ کوشش کریں کہ تو میرے ساتھ کسی کو شریک ٹھیرائے جس کا تجھ کو کوئی علم نہیں تو مت مان ان کا کہا!"

یہ اُسی قرآن پاک کی آواز تھی جس نے انسان کو خدا کے شکر کے ساتھ ساتھ والدین کے شکر پر اُبھارا ہے۔

سعدؓ کے قدموں کو لڑکھڑانے میں ماں ناکام ہوئی تو بے رحمی آگے بڑھی۔ اپنائیت کے بعد بیگانگی نے وار کیا۔ آنسوؤں کی بارش رُکی تو پتھراؤ شروع ہو گئے۔ کانٹے برسے۔ شعلوں کی بوچھار ہوئی لیکن جوان سعدؓ کا جذبۂ حق جوان ہی رہا ___ نہیں! ___ اس پر تو جیسے کچھ اور ہی شباب آگیا۔ اس کے حوصلے اور ولولے کچھ اور امنڈ پڑے خود کو بچانے کے بجائے تیر و نشتر کی زد پر اس نے صرف سینہ ہی نہیں کھول دیا۔ بلکہ اس نے تو اس وقت بھی آستینیں چڑھالی تھیں جب مکے کی قہرمانیت پوری بستی میں حق پسندوں کے گریبان چاک کر رہی تھی۔ ہاں جس وقت اللہ والے محض آنسو پی رہے تھے۔ کفر کا خون پی لینے کے لیے سعدؓ کے نوجوان خون میں شعلے بھڑک اُٹھے تھے۔ جب پہاڑ کی ایک خاموش گھاٹی میں چھپے ہوئے خدا کے چند بندے اپنے خدا کو یاد کر رہے تھے ___ جب کافروں کی ایک خرمست ٹولی ادھر آنکلی اور کفر نے اسلام کی جاں بازی پر جرم ضعیفی کا دھوکہ کھا کر حق و صداقت پر قہقہہ لگایا تو یہ سعدؓ ابن وقاص ہی تو تھے جنھوں نے بے تحاشا آگے بڑھ کر ایک ہڈی کے بھرپور وار سے کفر کی سرکوبی کا پہلا تاریخی آغاز کیا تھا۔

ظلم و ستم کی آتشیں باڑھ کچھ اور تیز ہوئی ___ جب تک صرف جان خطرے میں تھی خدا کے بندے جان کی بازی لگائے ہوئے حق کا پیغام بلند کرتے رہے۔ لیکن جوں ہی جان سے بھی زیادہ پیارا ایمان خطرے میں پڑا تو یہ لوگ اس آخری قربانی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے جس کا چھوٹا سا نام ترک وطن اور ہجرت فی سبیل اللہ ہے۔ جنت خداوندی کے یہ زمینی شہری ___ دنیا بھر کو پردیس اور محض ایک حسین رہ گذر قرار دینے والے اٹھے اور گھر بار سے دامن جھاڑ کر خانہ ویرانی کی سمت چل نکلے۔

مکہ چھوڑا اور مدینے کی دور افتادہ بستی میں خانہ بدوشی کا پڑاؤ ڈالا ـــــ خطرہ اب بھی قائم تھا ـــــ خطرہ تھا کہ ایمان کے مکی دشمن اس قربانی کو دیکھ کر چین سے نہ بیٹھیں گے اس لیے قریش کی نقل و حرکت کی تفتیش کے لیے مجاہدوں کا ایک سرفروش رسالہ روانہ کیا گیا تو خدا کا یہ بندۂ بے باک بھی پروانہ وار ساتھ ہولیا ـــــ وہ تو ہر لمحہ اس لمحے کے لیے بیتاب تھا۔ جہاں وہ حق کو باطل سے ٹکرا ڈالنے، خدا کو چھو لینے والا سر بے چین تھا کہ خدا کی گلی میں کٹ کر گر پڑے ـــــ یہ رسالہ ساحل سمندر تک ریگستان کی خاک چھانتا چلا گیا تو وہاں قریشیوں کی ایک ٹولی دور سے دکھائی دی۔ سعدؓ کے لیے یہ منظر صرف دیکھنے کی چیز نہ تھا۔ رگ و پے میں دوڑنے والا خون جذبۂ جہاد بن کر اس کے ہاتھوں تک آ پہنچا اور دور فاصلہ پر نظر آنے والی جس دشمن خدا کی ٹولی پر لوگوں کی نظر مرکوز تھی۔ اس پر سعدؓ کے ترکش توحید کے تیر نے اپنا پہلا نشانہ لگا کر دم لیا! اسلام کی کمان کا یہ وہ پہلا تیر تھا۔ جس نے باطل کے سینے میں پیوست ہو کر جہاد فی سبیل اللہ کے معنی سمجھائے۔

یہ مہم سعدؓ کے جذبۂ قتال و جہاد کے لیے ناکافی ثابت ہوئی اس لیے وہ جیسے ہی اس مہم سے جذبۂ پیاس لیے ہوئے پلٹے تو ایک اس سے بھی بڑی مہم پر بے تابانہ روانہ ہو گئے ان کے سینے میں شہادتِ حق کی جو پرسوز آگ روشن ہو چکی تھی۔ اس نے ان کو مدینہ کے پُرامن ماحول میں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ وہ تو رہ رہ کر بے تاب اُٹھتے اور ان فداکاروں کے قدم بہ قدم سر دُھنتے ہوئے نکلتے جو اللہ والوں کو ہر خطرے سے بچانے کے لیے ہر خطرے کو ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ اس بار اس خطرات سے پُر مہم کی منزل مقصود مکہ اور طائف کا وہ درمیانی نخلستان تھا جہاں کفر و شرک کے بدترین زہریلے ناگ فضا میں زہرناک پھنکاریں چھوڑ رہے تھے۔ موت اور ہلاکت کے شیطانی جنگل میں داخل ہونے سے پہلے مہم کے سردار حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے ان خانہ بدوشانِ حق کی طرف رُخ کر کے بھرپور سوال کیا۔ "کون آگے جانا چاہتا ہے اور کون پلٹ جانے کا خواہاں ہے۔ آگے وہی

آئے جس کو شہادت اپنی جان عزیز سے پیاری ہو۔ مختلف چہروں سے جذبۂ شہادت کی چمک نمایاں ہوئی۔ سعدؓ کا چہرہ سب کے درمیان میں بے پناہ تمتماہٹ کے لحاظ سے اپنا جواب آپ تھا۔ جیسے تمام مجاہدوں کا گرم گرم خون اس ایک چہرے میں سمٹ کر شعلۂ جوالا بن گیا ہو ـــــ ان کی آنکھوں میں ایک ایسی چمک اُبل آئی جو ایک بہترین آرزو کی روحانی انگڑائی سے انسان کے وجود میں بجلی کی لہریں دوڑا دیتی ہے۔ ان کے دل کی ولولہ خیز دھڑکنیں جنبشِ لب تک آئیں اور ایک زبردست نعرۂ تکبیر میں ڈھل کر زمین سے آسمان تک گرجتی چلی گئیں۔ "ہاں ـــــ اے سردار! ہمیں شہادت جان سے بھی زیادہ پیاری ہے۔ خدا کی قسم! اسی مرنے کی آرزو میں جیتے ہیں ہم دیوانے! آپ ہمیں خطرات کے احساس دلا کر ڈرا رہے ہیں کہ اس جذبہ و جنون کی آگ کو بھڑکائے دے رہے ہیں۔ بڑھئے ـــــ کہ ہمارا خون ہماری رگ و پے سے پھوٹ نکلنے کے لیے بے تاب ہے!"

سعدؓ کا جوشِ جہاد آج اس آخری حد پر آ پہنچا تھا۔ جہاں مرجانے یا مار ڈالنے کے سوا کوئی تیسری راہ ممکن ہی نہیں رہتی لیکن جس مجاہد سے خدا کو کئی بڑے بڑے کام لینے باقی تھے بھلا وہ کسی ایسی ویسی گلی میں کیسے کام آجاتا ـــــ حسن اتفاق یہ ہوا کہ جب یہ چھوٹا سا دستہ وادی خوف و خطر کی طرف پھیلتا بڑھتا چلا تو ان کا اور ان کے ساتھی عتبہؓ بن غزوان کا اونٹ راہ سے بھٹک کر گم ہو گیا ـــــ اور شہادت کے متوالے کا اپنے دستے سے ایسا ساتھ چھوٹا کہ پھر مدینہ ہی میں ان سے ملاقات ہو سکی!

جب بدر کا پہلا وہ تاریخی رن پڑا جہاں اللہ والوں کی ننگی گردنیں ننگی آبدار تلواروں سے لپٹ لپٹ کر یہ بتانے چلیں کہ حق و صداقت کی راہ میں موت زندگی سے کہیں زیادہ لذیذ شے ہو جاتی ہے تو جیسے سعدؓ کے اندر تیرہ سال سے سویا ہوا شیر نر جاگ اٹھا۔ جب پہلی بار نہتے اسلام کے روبرو کفر و شرک کے اسلحہ خانے کھڑے تھے ـــــ جب پتھروں اور ستاروں کے بے حس پجاریوں کی طاقت ـــــ

وحشت وخونخواری کی طاقت کو یک جا کیے ہوئے ان مٹھی بھر انسانوں کو پیس ڈالنے کی قسم کھاتا ہوا ان پر لوٹا پڑتا تھا تو سعدؓ نے اسلامی صفوں کے بھوکے پیاسے چہروں اور پھٹے پرانے چیتھڑوں کے درمیان سے جست کی اور کفر کے پتھریلے سینے پر اس ایک نعرۂ تکبیر سے خراشیں ڈال دیں ـــــ

"سن لو اے دیوانو! کہ اللہ سب سے بڑا ہے!" ـــ وہ جذبۂ بیتاب جو گزشتہ تیرہ سال سے ان کے لہو میں ڈوبا رہا اور جاں نثار آنکھوں ہی آنکھوں تیر رہا تھا آج اُمنڈ کر ان کے بیتاب ہاتھوں کی راہ سے تلوار کے دستے پر آ پہنچا تو انسان نے جیسے جہاد کی شکل اختیار کر لی۔ وہ بڑھے تو کفر کی آہنی صفوں کو چیرتے چلے گئے۔ فولاد کی دیواریں کاغذ کی طرح پھاڑ ڈالیں اور کفر کی بھری فوج میں گھس کر اس کے ایک تاج زرنگار پر نفرت سے ٹھوکر مار دی۔ خدا کے آگے سرکشی کی جرأت کرنے والا ایک مکروہ ترین سر کٹ کر گرا ـــ یہ سعد بن العاص کا سر تھا ـــ یہ سر گردن سے اتار کر سعدؓ اس مقتول سردار کفر کی ذوالکتیفہ نامی وہ مشہور تلوار چھین کر اسلامی صفوں میں پلٹ کر آئے جس کو وہ کافر اسلام کی نفرت میں زہر میں بجھا بجھا کر بڑے حوصلوں سے میدانِ جنگ میں لایا تھا ـــ یہ وہ تلوار لیے ہوئے چلے تو راستے میں ان کے اپنے مسلم حقیقی بھائی حضرت عمیرؓ کی خون میں نہائی ہوئی لاش نے ان کا استقبال کیا لیکن سعدؓ یہ منظر دیکھ کر بھی ایمانی سرمستی سے وجد کرتے ہوئے چلتے رہے۔ نہ رُکے نہ لرزے۔ وہ والہانہ انداز میں بڑھتے ہوئے خدا کے رسولؐ کی خدمت میں پہنچے اور کہا "میں یہ تلوار لینا چاہتا ہوں جس کو میں نے بڑے چاؤ سے لوٹا اور جس کو چلانے کی حسرت ابھی میرے دل میں موجزن ہے۔"

اور جب رسولِ خداؐ نے ابھی تک مالِ غنیمت کے باب میں کوئی خدائی حکم نہ ہونے کی بنا پر سعدؓ کی فرمائش پوری کرنے سے انکار کر دیا ـــ جب سعدؓ کا جذبۂ جہاد و قتال مایوسی کی چوٹ کھا کر پلٹا تو ایک بار پھر سعدؓ کا خدا سعدؓ کے پیچھے پیچھے پکارتا ہوا آیا ـــ قرآن تلواروں کی چھاؤں میں نازل ہوا اور مالِ غنیمت

کے احکام عرش سے فرش پر سعدؓ کی دل جوئی کے لیے اترتے چلے آئے خدا کے رسولؐ نے سعدؓ کو فوراً بلا کر ان کی محبوب تلوار عطا فرما دی۔

جنگ احد کی بساط جب کفر کے دوسرے حملے سے نہیں ـــــ بلکہ درحقیقت خود کچھ مسلمانوں کی چوک سے اسلام کے خلاف الٹ گئی اور میدان کارزار اچھا خاصا میدان حشر بن گیا۔ جب خدا کو پہچاننے والی تابناک نظریں تھوڑی دیر کو اس طرح ماؤف و معطل ہوئیں کہ انسان تک کو پہچاننا دوبھر ہو گیا ـــــ جب حق پسندوں کی تلواروں سے حق پسندوں کی کتنی ہی گردنیں کٹ گئیں ـــــ ہاں اس وقت اگر طلحہؓ جیسا مجاہد آفتاب رسالتؐ کے لیے سینہ سپر ہو کر دشمنوں کے تیر پر تیر کھا رہا تھا تو سعدؓ ابن ابی وقاص جیسا جانباز، محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی جان گرامی کو اپنی گھائل جان کی آڑ میں لیے ہوئے محمدؐ کے دشمنوں پر اس بے جگری سے ترکش خالی کر رہا تھا جیسے بتا رہا ہو کہ "میری پشت پر تم جس "محمدؐ" کو دیکھ رہے ہو وہ تنہا نہیں خود خدا بھی اس کے ساتھ ساتھ میری کمک پر ہے پھر کون ہے جو مجھے اس وقت شکست دے سکے؟"

حملوں کی باڑھ جوں جوں تیز سے تیز تر ہو رہی تھی سعد کا ترکش خالی ہو رہا تھا۔ لیکن جیسے جیسے ترکش خالی ہو رہا تھا سعدؓ کے جذب و جنوں کے تیور کچھ اور زلزلہ انگیز ہوتے جا رہے تھے ـــــ اور ان کا یہ یقین ٹھاٹیں مارتا ہوا بڑھ رہا تھا کہ تیر ختم ہو سکتے ہیں اور ختم ہو جائیں گے لیکن میرے خدا کی غیبی طاقت کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔

اس فضا میں جب کفر کی سات سو فولادی زرہوں کا سیاہ بول ـــــ تین ہزار اونٹوں کا امنڈتا چڑھتا ہوا جھنڈ ـــــ دو سو گھوڑوں کی آندھیاں اڑاتی ہوئیں ہولناک ٹاپیں ـــــ اور پانچ ہزار خونخواروں کا کف اڑاتا اور خون تھوکتا ہوا وحشی غول ایک ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر پرتول کر ٹوٹا پڑتا تھا۔ جب

ایک ہزار حق پسند مجاہدوں کی روح رواں ـــــ خدا کا آخری پیغمبرؐ اپنے ایک ہزار دست و بازو مجاہدوں سے بچھڑ کر اس طوفانی چڑھائی کے نشانے پر کھڑا تھا۔ اس وقت سعدؓ کی حشر ناک تیر اندازی مہارت کے وہ جوہر دکھا رہی تھی کہ کافروں کی زبانیں تیر کھا کھا کر کتوں کی طرح باہر لٹکی پڑتی تھیں ـــــ اکیلے خدا کی بیکراں طاقت پر بھروسہ کرنے والے انسان کامل ـــــ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہونٹوں سے سعدؓ کو داد پر داد مل رہی تھی ۔

"یا سعد ارم ـــــ فداك ابی و اُمی !! ـــــ اے سعد! تیر مار! ـــــ میرے ماں باپ تجھ پر نثار! ـــــ یہ حضورؐ کی آواز تھی! ـــــ یہ سعدؓ کی للّٰہیت کن بلندیوں کو سر کر رہی کہ خدا کا رسولؐ اس طرح پکار اُٹھا! ـــــ اور یہ پکار سن کر سعدؓ کو محسوس ہو رہا تھا جیسے ان کے پورے وجود میں ساری کائنات کی طاقت اُبل اُبل کر سمٹ آئی ہے ـــــ خون کے ایک ایک قطرے سے جذبات کے سیکڑوں جوالا مکھی پھٹ پڑنے کے لیے بیتاب تھے ۔ سعدؓ نے اس آواز پر ترکش میں ہاتھ ڈالا تو اس کا آخری تیر ـــــ بے پھل کا شکستہ تیر ہاتھ آیا ـــــ سعدؓ کی ساری زندگی گرما کر اسی ایک تیر میں جذب ہو گئی اور یہ تیر کچھ اس طرح چلایا کہ پانچ ہزار خوں خوار سورماؤں کے ہجوم میں آگے بڑھنے والا دشمن تیر کھا کر اس طرح بوکھلایا کہ برہنہ ہو کر زمین پر ڈھیر ہو گیا ـــــ موت اور ہلاکت کے منجدھار میں مجاہد حق کی یہ قادر اندازی دیکھ کر حضورؐ اس قدر مسکرائے ـــــ اس قدر مسکرائے کہ آبدار دانتوں کے موتیوں کی پوری لڑی دکھائی دینے لگی ۔

ہائے مولا ـــــ کیسا تھا وہ تیرا بندہ ـــــ تیرا پیارا رسولؐ جس کا پُر یقین تبسم خطرہ و خوف کی گھٹا ٹوپ اندھیاری میں چاند سورج کو شرمائے دیتا تھا! ـــــ اور کیسے تھے اس پر وہ ایمان لانے والے جو اس کے تبسم کی روشنی میں اپنی زندگی کے ایک عظیم جنون سے موت کے لشکر کو بدحواس کیے ڈالتے تھے! ـــــ ہاں جن کو خدا کے سوا کسی کا بھی تو ڈر نہ تھا!! ۔

سعدؓ ابن ابی وقاص کی جاں نثاریاں یوں ہی جہاد سے جہاد تک گرجتی کڑکتی بڑھتی ہی رہیں ـــــ بدر و اُحد کے محاذوں سے نکلے تو فتح مکہ تک یہ بجلی چمکتی چلی گئی ـــــ فتح مکہ سے آگے بڑھے تو غزوہ حنین میں تیروں کی ہولناک آندھی پر عقابی نظریں جمائے ہوئے وہ اس وقت بھی پہاڑ کی طرح ڈٹے ہوئے تھے۔ جب ہزاروں مسلمانوں کے قدم یکبارگی اکھڑتے چلے گئے تھے۔ غزوۂ حنین سے اُبھرے تو غزوۂ طائف میں گھن گرج بن کر لپکے، اور وہاں سے پلٹے تو دیکھا گیا کہ تبوک کی راہِ پُرخار ـــــ شعلوں کی سڑک پر پاؤں میں چھالے ڈالے ہوئے اس طرح بڑھ رہے ہیں جیسے کوئی پھولوں کی سیج پر نازک خرامی کے مزے لوٹ رہا ہو!

لیکن ۲۳ سال تک آبلہ پائی اور جانثاری کے معرکے سر کرنے کے بعد بھی ان کو یہی محسوس ہوا کرتا جیسے ابھی تو وہ کچھ چلے ہی نہیں! ـــــ کیسی ہوتی ہوگی رضائے الٰہی کی وہ روحانی پیاس جس نے بندوں کے خون کو اس طرح سیماب بنا دیا تھا کہ جب تک جسم میں لہو کی ایک چھینٹ بھی باقی رہی ان کے دلوں کو قرار نہ آیا ـــــ!

سنہ ۱۰ھ میں ـــــ حجۃ الوداع میں شرکت سے محرومی پر سینہ فگار جب سعدؓ مکہ مکرمہ میں بستر علالت کی شکن بنے پڑے تھے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے واپس آکر ان کے پاس تشریف لاکر ان کا حال پوچھا تو فرض بندگی کے پیاسے سعدؓ کے ہونٹوں سے بیماری کے دکھ درد کی کوئی کراہ نکلنے کے بجائے کسی اور ہی حسرت کے آنسوؤں سے آنکھیں چھلک گئیں۔

"زندگی شاید ختم ہوا چاہتی ہے اے خدا کے رسولؐ! ـــــ اور آپؐ کے سعدؓ کا فرض ابھی تک جوں کا توں باقی ہے ـــــ خدارا اجازت دیجئے کہ وہ بے کس بندہ جو اب جان سے جہاد نہیں کر سکتا۔ اپنے مال ہی سے جہاد کا حوصلہ نکالے۔"

"کیا چاہتے ہو ـــــ اے سعدؓ!" حضورؐ ایک لطیف ترین مسرت کے ساتھ کچھ اور قریب آگئے اور اس انسان پر اپنی مقناطیسی نگاہیں جما دیں جس کی آنکھوں میں اس کا دل کھنچ کر آگیا تھا۔

"حضورؐ! ـــ میری کوئی اولاد نرینہ نہیں۔ تو پھر میں کیوں نہ دو تہائی مال و دولت راہ مولا میں لٹاتا چلوں۔"

"نہیں نہیں اے سعدؓ!" حد سے بڑھتی ہوئی جاں نثاری کو حضورؐ نے شفقت و حکمت سے تھپکی دیتے ہوئے روکا۔ لیکن اس دلاسے کے بعد بھی سب کچھ لٹا دینے کا جذبۂ سرشار سرد و مطمئن نہ ہوا ـــ بچوں کی طرح گڑگڑانے لگے بیمار سعدؓ۔ "اچھا ـــ اے خدا کے رسولؐ! ـــ بس آدھا مال لٹانے دیجیے۔ ـــ صرف آدھا!! ـــ"

"نہیں۔" حضورؐ کے الفاظ میں سعدؓ کے درد بندگی کی اشک آلود اور تبسم آمیز پذیرائی تھی۔ "دیکھو سعدؓ! اپنے پسماندگان کو مفلس و لاچار چھوڑ جانے سے کہیں زیادہ بہتر یہ ہے کہ تم انھیں مالا مال چھوڑ کر خدا کے پاس جاؤ تاکہ وہ زندگی کی بھیک مانگتے نہ پھریں ـــ اچھا اچھا! ـــ جاؤ ایک تہائی مال اپنے مولا کی راہ میں لٹا دو تم! ـــ مت سوچو کہ بیوی بچوں کا خیال رکھنے سے تم رضائے الٰہی کا کوئی حصّہ کھو بیٹھو گے ـــ جانتے ہو؟ ـــ بیوی کے منہ میں جانے والا ہر نوالہ تمھارے لیے ایک حسین توشۂ آخرت ہے۔"

یوں سعدؓ کے دلِ بیقرار کو دولت کی طرف سے سکون ملا تو وطن کی قربانی کا مسئلہ جاگ اٹھا۔ وہ مکّے میں بیمار پڑے تھے۔ وہی مکّہ ـــ ہاں وہی پیارا وطن جس کو ایک بار اور ہمیشہ کے لیے ادائے مشیت پر نثار کر چکے تھے۔ یہ سوچ کر وطنِ عزیز کی سہانی فضائیں ان کو پردیس سے زیادہ ڈسنے اور کاٹ کھانے کو دوڑنے لگیں۔ بیماری بڑھ رہی تھی اور یہ امید دم توڑ رہی تھی کہ شاید وہ ایک بار پھر اسی مدینے میں جا کر جینے اور مرنے کی دلی حسرت دل ہی دل میں لے جائیں گے جو ان کا جسمانی نہیں روحانی وطن بن چکا تھا۔ ضبط کے بند اس وقت پارہ پارہ ہی ہو گئے جب اس عالم میں حضورؐ ان کی عیادت کے لیے تشریف لائے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو دیکھنا تھا کہ شدّت ضبط سے ان کی گھٹی ہوئی چیخ نکل گئی اور وہ تکیے میں منہ دے کر سسکیاں

لینے لگے۔ "اب ..... اب کیا ہوگا اے خدا کے رسولؐ! کیا اسی سرزمین کی مٹی لکھی ہے جس کو خدا اور رسولؐ کی محبت میں قربان کر کے میں کیسا خوش ہوا کرتا تھا۔"

یہ ہچکیوں اور سسکیوں میں الجھتے، کانپتے اور ٹوٹتے ہوئے الفاظ سن کر حضورؐ کا دل بھر آیا اور آپ نے سچ مچ بیتاب ہو کر اپنا مقدس ترین ہاتھ سعدؓ کے پھڑپھڑاتے ہوئے سینے پر رکھ کر بے اختیار خدا کو پکارا۔

"میرے اللہ! سعدؓ کو شفا دے۔ میرے اللہ! سعدؓ کو شفا دے۔ میرے اللہ! سعدؓ کو شفا دے!!۔"

سعدؓ کو محسوس ہوا جیسے اس مقدس ہاتھ کے لمس سے رحمتِ خداوندی کا ٹھنڈا ٹھنڈا امرت ان کی نیم جاں دھڑکنوں پر شبنم افشانی کر رہا ہے ـــــ دل و جگر میں دعائیہ ہوک سے ٹھنڈک سی پڑتی چلی گئی اور پھر حضورؐ کی اس بشارت نے تو جیسے ان کے سہمے ہوئے دل کو پھر سے شیر کر دیا ـــــ "نہیں اے سعدؓ! ـــــ تم اس وقت تک نہ مرو گے جب تک تم سے ایک قوم کو نقصان اور دوسری قوم کو نفع نہ پہنچ لے۔

اس وقت سعدؓ کچھ نہ سمجھے تھے کہ اس بشارت کی تفصیل کیا ہے؟ ـــــ لیکن عراق اور قادسیہ کی فوج کشی کی کمان ان کو عطا ہوئی اور عرب نے عجم کو شکست فاش دی تو ان کو پتہ چلا کہ حضورؐ نے کیا اشارہ فرمایا تھا۔

عراق کی وہی عظیم مہم جہاں حضرت ابو عبیدہؓ جیسے مجاہد کام آ چکے تھے ـــــ جہاں مثنیٰ شیبانی کے آٹھ ہزار جیالوں کو فتح و کامرانی کا کچھ سراغ نہ ملا تھا ـــــ سوال تھا کہ کون اس محاذِ خوف و خطر پر جست لگانے کا اہل ہو سکتا ہے آخر؟ حضرت عمرؓ بن الخطاب کی بارگاہِ خلافت میں اُمت کے بڑے بڑے دل و دماغ اسی سوال کی اُدھیڑ بُن میں گم تھے کہ اچانک حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی ولولہ انگیز آواز نے فکر میں ڈوبے ہوئے سروں کو چونکا دیا۔

"پالیا! ـــــ پالیا!! ـــــ میں نے پالیا!!!"

"کون؟ ـــــ کس کو پالیا آخر؟" ایک ساتھ کئی زبانوں پر یہ حیرت بھرا سوال آگیا "کون ہے وہ جاں باز جو اس کوہِ گراں کو اٹھا لینے کی صلاحیت رکھتا ہے؟"

"سعدؓ ابن ابی وقاص!" حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف چلائے اور حسنِ انتخاب پر فخر و مسرت کی ایک نشیلی چمک سے ان کی آنکھوں میں نور کے دیئے جل اُٹھے۔ یکایک سننے والوں کے سینے میں ولولہ و خروش کا تلاطم سا اٹھ کھڑا ہوا اور نعرۂ تکبیر کی فلک شگاف گونج میں کتنی ہی زبانوں پر تائید مچل اٹھی۔ "بے شک ـــــ تم نے سچ مچ پالیا عبدالرحمٰنؓ! ـــــ سعدؓ کے شانوں میں واقعی اتنا کس بل ہے کہ وہ اس پہاڑ سی ذمہ داری کا حق ادا کر سکتا ہے ـــــ!"

یوں اس مجاہد کی مجاہدانہ سپہ سالاری کا شان دار دور شروع ہوا۔ تیس ہزار مجاہدوں کے ٹڈی دل پر کڑی نظریں جمائے ہوئے یہ بندۂ حق آگاہ چلا تو اس کے عجز بندگی سے مَس ہو کر جنگ کی یہ پتھریلی وادی پانی پانی ہو گئی۔ ٹھیک اسی وقت جب عرق النسار کا ہڈی توڑ دینے والا درد ان کو نچوڑے ڈالتا تھا وہ فوجوں کی صفیں درست کر رہے تھے ـــــ جنگ کے خطرناک نقشوں پر جھکے ہوئے خونِ دل و جگر سے جہاد کے ایک عظیم ترین خاکے میں رنگ بھر رہے تھے۔ جسم کا درد روح کی کسک میں دب کر گم ہو چکا تھا ـــــ رسول خدا کی اُمت کا درد عرق النسار کے درد پر چھایا ہوا تھا۔ نہیں! وہ صرف مسلمانوں ہی کے لیے دل دردمند لیے ہوئے نہیں تھا ـــــ اس کو تو خدا کے سارے کنبے۔ ساری انسانیت کا غم ستا رہا تھا۔ وہ گردنیں کاٹنے سے پہلے بے چین تھا کہ جس کے سوا کوئی آستاں انسان کی سجدہ ریزی کے لائق ہی نہیں ہے ـــــ اس نے بار بار یہ کوشش کی کہ حق و باطل کی جنگ کا فیصلہ تلواروں کے بجائے دل کی دھڑکنیں کر سکیں ـــــ بار بار اس نے تبلیغی وفد ایرانی حکومت کے پاس روانہ کیے ـــــ وہ بار بار پکار اٹھا کہ "اے لوگو! خدا کی قسم ہم تمھارے ملک کے بھوکے نہیں۔ خود تمھارے لیے آسمانی جنت کی کنجیاں لے کر تمھارے پاس آنے کے لیے بیتاب ہیں۔"

لیکن جب صدائے حق نے پتھریلے دلوں پر اثر نہ کیا اور اس ایمانی سوز کے جواب میں رستم کی یہ حیوانی چنگھاڑ سنائی دی کہ "کل تمھاری فوجوں کو تہ و بالا کر ڈالا جائے گا" تو دردِ انسانیت سے سلگتے ہوئے سعدؓ میں غیرت، توحید کا ولولہ جاگ اٹھا اور نعرۂ تکبیر کے فلک شگاف جوش کے ساتھ سعدؓ نے جنگ کی للکار قبول کرتے ہوئے مجاہدوں سے کہا ــــ

"اے اسلام کے جیالو! ــــ اُٹھ کھڑے ہو اور حق کے دشمنوں پر ہوش اور جوش کی حجت تمام کر دو۔"

جہاد کا سیلاب تیز و تند لیے ہوئے سعدؓ کچھ اس طرح بڑھے کہ ایرانی سلطنت خس و خاشاک کی طرح بہہ گئی۔ قادسیہ فتح ہوا، بابل قدموں پر گرا ــــ کوثی کی وہ تاریخی بستی خم ہوئی جہاں نمرود نے کبھی ابراہیم علیہ السّلام کو سلاسل میں جکڑنے کی کوشش کی تھی۔ ــــ مدائن کی طرف رُخ کیا اور ایرانیوں نے دجلہ کے پل اڑا دیئے تو سعدؓ مجاہدانہ للکار اُٹھے: "کود پڑو دریا میں اے خدا کے جاں بازو! ــــ کود پڑو۔" یہ کہا اور سمندر میں گھوڑے دوڑاتے ہوئے اس طرح آگے بڑھے کہ ایرانی سپاہی سراسیمہ حیرت کے عالم میں چیخ اُٹھے "دیوہا آمدند ــــ دیوہا آمدند"! ــــ جن آگئے! جنات آگئے! لیکن وہی انسان جس کی کمان میں گرجتے چمکتے مجاہدوں پر دیوؤں اور جنوں کا شبہ ہوتا تھا ــــ ہائے وہ کتنا بڑا انسان تھا! ٹھیک اس وقت جب اس کے ہاتھوں میں پہاڑوں کی ولایت نظر آرہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خداشناسی کے عرفان اور عبرت کے سلیقے نے سوز گداز بھرے آنسوؤں سے چراغاں کر دیا تھا ــــ ہارے ہوئے مدائن کی سجدہ ریز بستی کو خاموش و دم بخود دیکھ کر اس کو ایک لمحہ کے لئے بھی زورِ بازو پر گھمنڈ کرنے کی مہلت نہ دی اس کی خداشناسی نے! ــــ یہ قرآنی آیات ان کے لبوں پر آگئیں۔ "کس قدر باغ، چشمے (کھیتیاں) اور گوناگوں نفیس و عمدہ محلات چھوڑ کر (اگلی قومیں) چل دیں جن میں وہ خوش باش زندگی بسر کرتی تھیں اور ہم نے ان چیزوں کا مالک دوسری قوموں کو بنا دیا۔"

دنیا صرف یہ منظر دیکھ رہی تھی کہ سعدؓ کی تلوار کسریٰ کے سنہرے محلات تاج و تخت پر کوندتی لہراتی خلافتِ اسلامیہ کے نقشے میں نت نئے شہروں کا اضافہ کر رہی ہے۔ دولت کا سیلاب عجم سے عرب کی طرف رواں دواں ہے ـــ لیکن سعدؓ خود اپنے اندر جھانک کر یہ منظر دیکھ رہے تھے کہ جوں جوں جہاد کے فرائض کا بوجھ ہلکا ہوتا جا رہا ہے ان کا وجود فقر و بے نیازی کی ایک نرالی تڑپ میں ڈھلتا جا رہا ہے۔ دولت کے خزانے ان کے قدموں میں ڈھیر ہو رہے ہیں ـــ محلات اور قلعوں کے آہنی دروازے ان کے سامنے کھل رہے ہیں ـــ اقتدار و شکوہ کے پرچم ان کی شخصیت پر لہرا رہے ہیں، لیکن ان تمام فاتحانہ کارناموں کے ساتھ ساتھ خدا کا خوف اور آخرت کی درد بھری یاد ان کی پوری زندگی کو دنیا سے دور ـــ بہت دور تیزی سے کھینچے لیے جا رہی ہے یہی تھا وہ دردِ دل جس نے تلوار سے بھی بڑا کام کیا ـــ ہتھیاروں نے صرف عجم کی زمین جیتی تھی اور اس سوز نے آتش پرستوں کے سینوں میں توحید کی آگ کوٹ کوٹ کر بھر دی۔ زمین فتح ہو جانے کے بعد دلوں کی دنیا پر فتح پائی سعدؓ نے ـــ ہتھیاروں کی گھن گرج دیکھ کر عجمی سپاہ نے ہتھیار ڈالے تھے اور سعدؓ کے مومنانہ سوز و گداز کو دیکھ کر ان لوگوں نے خدائے واحد کے قدموں پر بے تابانہ سر ڈال دیئے ـــ بڑے بڑے سردار حق کی شہادت دیتے ہوئے اسلام کی طرف والہانہ جوش سے بڑھے ـــ ویلم کی چار ہزار کی سپاہ نے یکایک ایک ساتھ اسلام کی عظمت کے سامنے سر جھکا دیا۔

سعدؓ کی روح میں دولت دنیا سے بے پروائی اور دولت دل کی بڑھتی ہوئی تڑپ اس طرح بڑھی کہ ان کے رگ و پے سے پھوٹ نکلی ـــ ماحول میں سرایت کر گئی۔ آنکھوں سے نظر آنے لگی۔ دنیا نے ایک دن یہ حیرت ناک منظر بھی دیکھ لیا کہ امیر المومنین حضرت عمرؓ کا ایک ہرکارہ کوفہ میں داخل ہوا اور سعدؓ کے گھر کی بیرونی ڈیوڑھی کو آگ لگا کر چلا گیا۔ اور سعدؓ ـــ وہی سعدؓ اطاعت و عجز کے ساتھ ٹھنڈے دل اور کھلی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھتے رہے جنھوں نے ایرانی سلطنت کی بساط الٹی تھی اور جنھوں نے اس کوفہ کو آباد کر کے گھر کے آگے یہ ڈیوڑھی محض اس لیے تعمیر کی تھی کہ بازار کے شور و غل سے

محفوظ و مامون رہ سکیں ـــــ لیکن جس کو امیر المومنین رضؓ نے محض اس دور اندیشانہ مصلحت سے
نذر آتش کرا دینا ضروری سمجھا کہ کہیں یہ ڈیوڑھی حاکم اور محکوم قوم کے درمیان انصاف و
عدل کی راہ میں حائل نہ ہو جائے۔ حق و انصاف کی ہر ہلکی سے ہلکی بعید سے بعید مصلحت
سعدؓ کو اپنی فاتحانہ، مجاہدانہ جد و جہد کی پوری عمر سے بھی زیادہ پیاری تھی ـــ انھوں
نے خندہ پیشانی سے اس مصلحت کو سینے سے لگا لیا اور ذاتی عزت و جاہ کے ہر جائز
سے جائز مطالبہ سے کنارہ کش ہو گئے ـــــ یہی نہیں ہوا بلکہ یہ بھی ہوا کہ کوفہ کے کچھ
ذاتی مخالفوں نے محض بر بنائے اختلاف بارگاہ خلافت میں حضرت سعدؓ کے
خلاف یہ شکایت بھیجی کہ "وہ نماز ٹھیک طریقہ سے نہیں پڑھاتے!" ـــــ سعدؓ
نے اس شکایت کو کمال صبر و تحمل سے سنا۔ بارگاہ خلافت سے اس شکایت کی
چھان بین کے لیے حضرت محمدؓ بن مسلمہ کوفہ میں آئے اور گھر گھر مسجد مسجد اس شکایت
کے ذیل میں عوام کے بیانات قلم بند کرتے رہے۔ سعدؓ نے عدل و انصاف کی اس
کارروائی کو بھی خدا کے ایک بندۂ عاجز کی شان سے دیکھا اور سنا ـــ پھر
خلافت کے صرف ایک اشارے پر انھوں نے ان تمام علاقوں کی حکمرانی
سے برداری دے دی جن کو انھوں نے خون دل و جگر سے جیتا اور آباد
کیا تھا ـــــ وہی مجاہد جو اپنے حیرت ناک عزم و عمل کے ساتھ سپاہ سالاری اور
حکمرانی کی بلندیوں تک پہنچا تھا جب خدا نے چاہا کہ وہ ان بلندیوں کو قربان کر دے
تو دنیا نے دیکھا کہ اس نے اپنی پوری زندگی اسلام کے قدموں پر ڈال دی، اور
سلطنت و حکومت کے تخت سے اُٹھ کر فقر و بے نیازی کے گوشے میں سمٹ
گیا۔ ان کی زندگی میں جہاد اور جہاد نفس کی یہ بے پناہ عظمت وہ شے تھی جس کو
حضرت عمرؓ ابن خطاب نے اس وقت خراج عقیدت پیش کیا جب وہ قاتلانہ گھاؤ
کھائے ہوئے بستر شہادت پر لہو میں نہائے ہوئے لیٹے تھے۔ انھوں نے اعلان فرمایا
کہ "میں نے سعدؓ کو ہرگز کسی بددیانتی کے شاخسانے میں معطل نہیں کیا تھا" یہ
کہا اور خلافت کے لائق صحابہؓ کی فہرست میں حضرت سعدؓ ابن ابی وقاص کا نام

نامی شامل کر کے دنیا کو بتایا کہ یہ ہستی صرف کوفہ کی حکمرانی ہی نہیں، بلکہ پوری خلافتِ اسلامیہ پر راج کرنے کے قابل تھی۔

لیکن حضرت سعدؓ نے جب زمانے کے یہ تیور دیکھے کہ اسلام کے ہر اُفق سے خطرناک فتنوں سے طغیانی سر اُٹھا رہی ہے اور خطرہ ہے کہ مسلمانوں کا خون ان اختلافات کی بھینٹ نہ چڑھ جائے تو وہ تاج و تخت کی پیش کش سے دامن بچا کر فقر و بے نیازی کی تنہائیوں میں سمٹتے چلے گئے ـــــ سمٹتے چلے گئے یہاں تک کہ خود ان کے صاحبزادے پکار اُٹھے۔

"ابا جان! ـــــ یہ کیا ہو رہا ہے آپ کو! ـــــ آپ جنگل میں اونٹ چرائیں اور ـــــ لوگ تاج و تخت کے لیے قسمت آزمائیں!"

"خاموش!" جوش کے ساتھ حضرت سعدؓ نے بیٹے کے سینے پر ہاتھ مارا "میں نے خدا کے رسولؐ سے سنا ہے کہ خدا مستغنی اور پرہیزگار بندے کو پیار کرتا ہے ـــــ پھر کسی نے چھیڑا تو گوشہ نشینی کے راز پر سے یوں نقاب اٹھایا کہ "میں نے رسول خداؐ سے سنا ہے کہ عنقریب میرے بعد ایک فتنہ برپا ہوگا جس میں سونے والا بیٹھنے والے سے، بیٹھنے والا کھڑے ہونے والے سے اور کھڑا ہونے والا چلنے والے سے اچھا ہوگا۔"

اس طرح وہ تلوار جس نے عرب و عجم کی خوں ریز لڑائیوں میں کفر و شرک کے سر قلم کیے تھے خونِ مومن کے تصور سے لرزہ براندام ہو کر ہمیشہ کے لیے نیام میں چلی گئی اور وہ عظیم مجاہد جس کی ستر سال سے زیادہ طویل زندگی کا ہر سانس جنگ و جہاد کے معرکہ زاروں میں بیتا تھا آخر دنیا کے دارالامتحان سے کامیابی کے ساتھ دور نکل کر قبر کی راہ سے گزرتا ہوا اپنے خالق و پروردگار سے اس طرح جا ملا کہ اس کے جسم پر جنگ بدر کا وہ بوسیدہ اونی کپڑا کفن کی شکل میں لپٹا ہوا تھا جو اللہ کے رسولؐ نے تبرک کے طور پر ان کو عطا کیا تھا ـــــ ان کے وہ ہاتھ رحمت خداوندی کے لیے پھیلے ہوئے تھے جنھوں نے دولت دنیا کے خزانوں کو جیتے جی لٹا دیا تھا اور ان کے دل میں خدا اور خدا کے رسولؐ کے سوا کسی کے لیے کوئی

جگہ نہ تھی ۔

ہم سے تاریخ کہتی ہے کہ یہ جہاد و ایثار کی داستانیں تمھاری ہیں ـــــ لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ اب یہ داستانیں لکھنا تو کیا اُن کو پڑھنا بھی یاد نہیں رہا ہم کو! ـــــ اپنے مستقبل کی تاریکی میں ٹھوکریں کھاتے ہوئے ہم خود اپنے ماضی کی اس روشنی سے دور سے دُور تک ہوتے جا رہے ہیں ـــــ بجھے ہوئے دل، بے نور آنکھیں اور چکرائے ہوئے دماغ لیے ہوئے آخر ہم کدھر بہتے چلے جا رہے ہیں؟ ـــــ تاریکیوں کے طوفانی تھپیڑے حملہ کرتے ہوئے چیختے ہیں۔ "کیا تم مسلمان ہو؟" ـــــ دنیا ہماری تباہی پر قہقہہ لگا کر پوچھتی ہے "کیا یہ مسلمان ہیں؟" لیکن ہائے ہمارا حال ـــــ کہ ہم خود اب بھی یہ سوچنے کی ضرورت نہیں سمجھتے کہ "کیا ہم مسلمان ہیں؟"۔

○

وہ نشانِ سجدہ جو روشن تھا کوکب کی طرح
ہو گئی ہے اس سے اب نا آشنا تیری جبیں
تیرے آبا کی نظر بجلی تھی جس کے واسطے
ہے وہی باطل ترے کاشانۂ دل میں مکیں

٭

جوانی اور ــــ قربانی

جوانی میں یہ دنیا بہت خوب صورت نظر آتی ہے ــــ
جوانی انسان کو اس دنیا میں جینے پر لبھاتی اور اکساتی ہے ــــ
لیکن کتنی خوب صورت تھی حضرت مصعبؓ بن عمیر کی جوانی جو دنیا پر نہیں، آخرت پر نثار ہوئی! ــــ انھوں نے عورت سے نہیں، خدا سے عشق کیا ــ وہ شباب و شعر اور دنیائے رنگ و بو پر نہیں رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے۔ اس ایمان سے پہلے وہ کچھ اور تھے۔ ایمان لاتے ہی کچھ سے کچھ ہو گئے! ــــ ابھی تھوڑی دیر پہلے تک مال و دولت کی نشیلی چھاؤں میں اور ماں کی پر شوق ممتا کے سائے میں وہ زندگی کی دل فریب اور ایمان شکن شاہراہ پر اس طرح آگے بڑھ رہے تھے کہ زندگی سے ہٹ کر موت اور موت کے اس پار تک کچھ سوچنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ وہ شباب و حسن سے ناز کرتے ہوئے اپنے نفیس لباس کی عطر میں ڈوبی سرسراہٹ سے مکے کی گلی کوچوں کو مہکاتے ہوئے ــــ جدھر سے گزرتے مکے کی دوشیزاؤں کی نظریں ان پر جم کر رہ جاتی ہوں گی۔ بھلا کون کبھی یہ سوچ بھی سکتا تھا کہ اسی نوجوان کی دنیا میں ایسا عظیم انقلاب آنے والا ہے جب اس کے وجود پر خدا کی نظرِ انتخاب پڑ رہی ہو گی۔ جب عیش و آرام کی بجائے دُکھ درد اسے پیارے ہوں گے ــــ نفیس و معطر کپڑوں کو چھوڑ کر چیتھڑے لگانے میں اس کو لطف آئے گا۔ زندگی اور دنیا کی لذتوں پر جھومنے کے بجائے وہ سچائی اور آخرت پر مرجانے کی آرزو کرے گا تاکہ اس کی موت پر زمین و آسمان روئیں اور خدا خوش ہو کہ اس کا بندہ اس کی بارگاہ تک آ پہنچا ــــ

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جوں ہی ان سے ان کے حقیقی خدا کا تعارف

کرایا حضرت مصعبؓ بن عمیر کی آنکھوں پر سے دنیا کے سارے حسین پردے اُٹھتے چلے گئے اور آخرت اپنے پورے حسن کے ساتھ ان کے سامنے آگئی۔

آخرت ——— جس کے یقین سے محروم ہو کر کوئی بڑے سے بڑا انسان چاہے اور سب کچھ بن جائے مگر "انسان" نہیں بن سکتا۔

آخرت ——— جس کا یقین انسان کو جینا بھی سکھاتا ہے اور مرجانا بھی۔

آخرت ——— جہاں سے جنت کی خوشبو آتی ہے تو انسان اس دنیا میں زخموں کی مالا پہن کر بھی ——— کانٹوں سے سینہ فگار ہو کر بھی۔ ——— شعلوں پر آبلہ پا چل کر بھی اس طرح مسکرا سکتا ہے جیسے یہ کانٹے نہیں پھول ہوں۔ زخم نہیں مرہم ——— شعلے نہیں لالہ و گل ہوں۔

اپنے دل سے تمام بتوں کو نکال کر اس میں حقیقی خدا کی یاد بسانے کے بعد جب حضرت مصعبؓ بن عمیر نے اپنے چاروں طرف نظر ڈالی تو دیکھا کہ حق و باطل میں موت اور زندگی کی جنگ ہو رہی ہے۔ خود ان کے اپنے گھر میں ابھی تک ان کی ماں ——— ان کی بے حد چاہنے والی ماں پتھر کے جھوٹے خداؤں کے آگے اپنی ناک رگڑ رہی تھی۔ ان کا دم گھٹنے لگا ——— مگر انھوں نے اپنے ہونٹ سی لیے۔ اپنے دل میں سلگتی ہوئی حقیقت کی آگ کو اپنے سکوت کے دامن میں چھپا لینا چاہا ——— اور آخر آخر ان کا دامن جلنے لگا اور ——— حقیقت خود بخود دنیا کے سامنے آگئی۔

ان کو دنیا نے اس حالت میں دیکھ لیا کہ وہ اَن دیکھے مگر ہر شے کو دیکھنے والے خدا کے آگے سجدے میں پڑے ہوئے انسان کی بدنصیبی اور "خودکشی" پر آنسو بہا رہے ہیں۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟" ان کی ماں نے وحشت بھری آنکھوں سے اس طرح دیکھا جیسے وہ دنیا کا سب سے بڑا جرم کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لیے گئے ہوں

"میں اس خدا کو سجدہ کر چکا ہوں جو واقعی خدا ہے۔" انھوں نے پوری

جرأت اور غیرتِ حق کے ساتھ اعلانِ حق کیا ..... "میری ماں خدا کے سوا کوئی خدا ہے ہی نہیں اور محمدؐ اس کے سچے رسول ہیں۔"

"بس! ـــــ بس کر!!" ان کی ماں کو باطل پرستی کے جنون نے اچانک نفرت کا شعلۂ جوالہ بنا دیا اور ـــــ ماں اور بیٹے کے درمیان جھوٹ اور سچائی کی وہ لرزہ خیز لڑائی ٹھن گئی جو خونی رشتوں کی شہ رگیں تک کاٹ ڈالتی ہے ـــــ جب محبت اور نفرت کے جذبات زندگی کے گوشے گوشے سے سمٹ کر صرف ایک محاذ، صرف ایک محور پر گردش کرنے لگتے ہیں ـــــ "جھوٹ اور سچائی!" یہی ہوتا ہے وہ افسانہ سوز اور حقیقت افروز مقام جہاں انسان کو ایک بار یہ پُر فریب دنیا اپنی تمام ناپاک سازشوں اور دھوکہ بازیوں کے ساتھ قطعی ننگی نظر آتی ہے ـــــ جہاں خدا کا بندہ یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ درحقیقت عبد اور معبود ہی دو حقیقی رفیق ہیں ـــــ اور یہ کہ دنیا کے تمام سہارے جو سہارے نظر آتے ہیں اس دنیا کا سب سے جان دار فریب ہیں ـــــ قلعے نہیں ریت کی دیوار ہیں جن کو کبھی کبھی حقائق کا ایک ہی تیز و تند جھونکا گرد بنا کر اُڑا دیتا ہے۔ آزمائش کے اسی طوفانی موڑ پر حقیقی ایمان اور نفاق دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ یہاں للّٰہیت کے مصنوعی اور کھوکھلے دعوے نہیں چلتے ـــــ ایک قدم نہیں چلتے ـــــ دھڑام سے منھ کے بل آ رہتے ہیں۔ حق پرستی کے فلک شگاف اعلان غضب ناک باطل کی پہلی ہی جھڑکی میں ممیانے لگتے ہیں ـــــ مگر ہاں! یہی وہ موڑ بھی ہوتا ہے جہاں حقیقی ایمان کی دبی ہوئی چنگاری انسان کے اندر سے آتش فشاں بن کر پھٹ پڑتی ہے اور باطل کے لاؤ لشکر کو اس کی تمام یورشوں کے ساتھ اپنی سُرخ و جھلساتی راکھ میں دفن کر کے چھوڑتی ہے۔ اس مومن کی بے کسی ہی اس کی سب سے بڑی طاقت بنتی ہے۔ اس کی بے سروسامانی ہی اس کو اس طرح مسلح کرتی ہے کہ تنہا سپاہی یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ بیک وقت تمام عالم سے تن تنہا جنگ کر سکتا ہے ـــــ جنگ کر سکتا ہے اور ہرگز شکست نہیں کھا سکتا ـــــ اس لیے کہ باطل زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہے کہ اس کی

گردن کاٹ ڈالنے کی کوشش کرے ـــــ لیکن اس کی گردن کٹ تو سکتی ہے باطل کے آگے جھک نہیں سکتی ـــــ

اور ایک ہی جست میں! ـــــ حضرت مصعبؓ بن عمیر اسی مقامِ بلند تک جا پہنچے تھے!

ان کو محبت اور ہمدردی کی آنچ سے پگھلانے کے جتن کئے گئے مگر وہ ایک چٹان ثابت ہوئے۔ ان کو لذتوں اور راحتوں کے عوض خرید لینے کے جال ڈالے گئے مگر وہ اس کوشش پر نفرت سے مسکرائے اور درد کے ساتھ دنیا کے حال پر روئے ـــــ ان کو افلاس و بے چارگی سے ڈرایا گیا مگر آخرت کی بھیانک رسوائی اور ہلاکت کے خوف نے دنیا کے ہر خوف و حزن کو پیس ڈالا اور ـــــ ٹھیک اسی وقت خدا نے اس جواں سال بندے کے دل پر "دولتِ دل" کے لازوال خزانوں کا منہ کھول دیا۔

وہ ساری دنیا سے دامن جھاڑ کر اُٹھے ـــــ ماں کو چھوڑ دیا ـــ گھر چھوڑ دیا ـــ اپنے قیمتی لباس چھوڑ دیئے۔ لذیذ کھانوں کے دسترخوانوں سے اٹھ گئے ـــــ وطن چھوڑ دیا ـــ ایک خدا کے لیے ساری دنیا کو چھوڑ دیا ـــــ وہ اُٹھے اور حضورؐ کی اجازت سے مسلمانوں کے اس قافلے کے ساتھ ہو لیے جو اس وقت کے نئے وطن اسلام کے لیے خود کو بے وطن کر رہا تھا ـــــ مکہ چھوڑ کر حبشہ جا رہا تھا۔ ترکِ وطن یقیناً کوئی کھیل نہیں۔ لیکن یہی شے ان لوگوں کے لیے ایک دلچسپ کھیل تھا جن کو یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ ان کا گھر اس دنیا میں کہیں نہیں بلکہ اس دنیا میں ہے جو جسم و جان کا تعلق ٹوٹتے ہی شروع ہوتی ہے اور پھر ختم نہیں ہوتی ـــــ ایک دنیا جہاں خدا اپنے بندوں کے انتظار میں ہے کہ کون دنیا کے بدلے آخرت اور کون آخرت کے لیے اپنی دنیا بیچ کر وہاں پہنچتا ہے ـــــ جہاں ایک طرف وہ جنت ہے جس کے گہرے سبز اور ہلکے سبز باغات کی سرسراہٹوں اور شیر و شہد کی اٹھلاتی ہوئی، لہراتی ہوئی ندیوں کے کنارے ـــــ خوف و غم کی پرچھائیوں سے دور ایک حسین ترین دائمی زندگی سچے خوابوں کے جال بُن رہی ہے ـــــ اور جہاں دوسری طرف آگ اور ناگ والا

دوزخ ہے کہ جس میں انسانی ہڈیوں اور کھوپڑیوں اور پتھروں سے بھیانک ایندھن کا کام لیا جائے گا ـــــ جہاں آگ، بھوکی آگ انسان کو کھائے گی اور انسان، بھوکا پیاسا انسان آگ کو کھائے گا اور ـــ دوزخیوں کے زخموں کا دھوون اور پیپ پیے گا ـــ

حضرت مصعبؓ بن عمیر جب حبشہ کی طرف چلے تھے تو ان کے ہاتھ پاؤں پر محض ان زنجیروں کی خراشیں تھیں جن میں ان کی غضب ناک ماں نے ان کو جکڑ ڈالا تھا مگر وہ واپس آئے تو جہاد و عزیمت کی سخت بھٹی نے ان کے پھول سے جسم کو تپا کر کندن بنا دیا تھا ـــ مکّے کی گلیوں نے جس جوان رعنا کو کبھی حسین ترین کپڑوں میں خراماں خراماں گزرتے دیکھا تھا اب وہی جسم تھا جس پر محض ایک چادر لپٹی تھی اور اس چادر میں بھی چمڑے کے جوڑ اور پیوند سلے ہوئے تھے! ـــ پھول سے رخسار کمھلا گئے تھے گوشت سے بھرپور چہرہ اُتر گیا تھا۔ خوب صورت پیشانی پر غریب الوطنی کی گرد تھی۔ جوانی کو درد آخرت اور فکر انسانیت نے زرد اور نڈھال کر دیا تھا۔ مگر دل؟ ـــ دل کی ایک ایک دھڑکن پر یہ یقین کیف و نشاط کے نورانی آبشار گرا رہا تھا کہ اب ان کے سفر آخرت کی منزل جہل و گناہ کی تاریکیوں میں ڈھکی ہوئی دوزخ کی آگ نہیں بلکہ زمین و آسمان کا نور۔ "خدا" اور خدا کی جنّت ہے ـــ ہر قدم جو اٹھ رہا ہے ان کو جنت سے قریب سے قریب تر اور جہنم سے دور اور دور تر کئے جا رہا ہے۔

اسی عالم میں ـــ وہ سیدھے رسول خداؐ کی خدمت میں باریاب ہوئے۔ آخری رسولؐ اور ایک جواں سال اُمّتی کی آنکھیں چار ہوئیں اور ـــ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں میں آنسو اور ہونٹوں پر تبسّم کھیلنے لگا۔

"دیکھ لو!" قلب رسولؐ پکار اُٹھا "دیکھ لو! یہ ہے وہ جوان جس کی ساری دنیا عشق الٰہی کے بازار میں لٹ گئی ہے۔"

اُدھر ماں کو بیٹے کی آمد کی خبر پہنچی اور یہ پیغام روانہ کیا:

"او نافرمان!..... اب تو اس شہر میں اس طرح آتا ہے کہ مجھ سے

ملنا بھی پسند نہیں کرتا .....!"

"اے ماں! میں اب رسول خدا کا ہوں۔" خدا کے جوان بندے نے کہلایا "اور اب حضورؐ سے ملے بغیر کسی سے بھی ملنا مجھے پسند نہیں۔"

آنحضرتؐ کے دیدار سے دیدہ و دل ٹھنڈے کرنے کے بعد ایک بار پھر وہ اپنی ماں سے ملے تاکہ اس کو دوزخ کی آگ سے بچانے کی ایک آخری کوشش کر دیکھیں۔

"کیا ابھی تک ..... اُسی دین پر ہو تم؟" خوں چکاں آواز میں ماں نے بیٹے سے پوچھا۔

"ہاں ـــــ اُسی دین پر جس کو خدا نے اپنے لیے اور اپنے رسولؐ کے لیے پسند کیا ہے۔" حضرت مصعبؓ نے جواب دیا اور درد و کرب بھری آواز میں ایک بار پھر کوشش کی کہ دوزخ کی طرف لپکتی ہوئی ماں کا دامن پکڑ لیں۔ مگر ماں نہیں، مانی ـــــ اور اس طرح خدا کے پرستار کا یہ نازک امتحان جاری ہی رہا کہ وہ ماں کے پیار کو قربان کرتا ہے یا اللہ کی رحمت کو؟

"قسم ہے روشن ستاروں کی!" بدنصیب ماں نے خوش نصیب بیٹے کا محبت بھرا ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا "میں ہرگز تیرے دین میں داخل نہ ہوں گی کہ میری رائے پر عیب لگایا جائے اور میری عقل کو ضعیف قرار دیا جائے۔ جاؤ! جاؤ!! میں تمھارے دین ہی کو نہیں خود تمھیں بھی چھوڑتی ہوں ....."

اور واقعی یہ ہوا کہ کفر و ایمان کی جنگ میں ماں اور بیٹے جدا ہو گئے۔ دونوں نے بظاہر ایک سی قربانی دی تھی مگر نتائج اور کیفیات کے لحاظ سے دونوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ ماں نے قربانی دی اور اس کے عوض غم و غصہ کا طوفانی عذاب حاصل کیا ـــــ بیٹے نے قربانی دی اور تسلیم و رضا کا خداوندی تحفہ پایا ـــــ ایک دل اس قربانی سے اور سخت ہو گیا ـــــ دوسرے دل میں کچھ اور گداز اور رقت پیدا ہو گئی اور اس نے محسوس کیا کہ ستم کرنے والی نے مجھ پر نہیں، خود اپنی جان پر یہ ستم ڈھایا ہے۔

اپنی جان پر ستم ڈھانے والوں کے لیے حضرت مصعبؓ بن عمیر کے دل میں کتنا سوز تھا اور اس میں کتنا اثر تھا، اس کا اظہار اس وقت ہوا جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مدینہ میں اسلام کا پہلا مبلغ بنا کر روانہ کیا۔ عقبہ کی پہلی بیعت میں جو بارہ انسان اسلام لا چکے تھے ان کے علاوہ پورا مدینہ کفر و شرک کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ایسے لوگوں کی آبادی میں گھس کر خدا کی یکتائی اور جھوٹے معبودوں کی بے سروپائی کا اعلان کوئی کھیل نہیں تھا۔

یہ اعلان بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دینے سے زیادہ خطرناک تھا۔ وہی شخص یہ اعلان کر سکتا تھا جسے خدا کی ذات و صفات کا کم سے کم اتنا یقین تو ہو جتنا خود اپنے وجود کا ـــــ اور جس کے دل میں یہ بات جم چکی ہو کہ راہِ حق میں مارا جانا ہی درحقیقت زندہ ہو جانا ہے ـــــ ہمیشہ کے لیے زندہ ہو جانا۔

اور ہماری طرح حضرت مصعبؓ بن عمیر کا دامن اس دولت یقین سے خالی نہ تھا ـــــ وہ تو سب کچھ لٹا کر اس یقین تک پہنچے تھے ـــــ اور اسی یقین پر اب اپنی زندگی بھینٹ چڑھانے کے لیے ہر لمحہ بے چین تھے۔ نہ جانے کیسا ہوتا ہوگا وہ یقین اور اس کی حیات انگیز کیفیت!؟ جس کے متعلق ہم نے دوسروں سے سنا ہے کتابوں میں پڑھا ہے ـــــ مگر کبھی خود اس یقین کے طوفان کو اپنے وجود پر سے گزرتے ہوئے محسوس نہیں کیا!.....۔"

حضرت مصعبؓ اس یقین کا دھارا بنے ہوئے مکّے سے چلے اور ریگستان کے ذرّوں کی پیاس اپنے چھالوں اور آنسوؤں سے بجھاتے ہوئے مدینے میں داخل ہوئے۔ زرآرہ منزل میں ٹھیرے اور انسانوں کے قلوب کو باطل سے حق کی طرف لوٹانے کے لیے ان کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ دل کی یہ درد بھری دھڑکن جلد ہی رنگ لانے لگی۔ ـــــ جہالت و نادانی نے جن دلوں کو پتھر کی طرح سخت کر دیا تھا ان میں ایمان کی حرارت پیدا ہوئی اور پتھر دل پانی ہونے لگے ـــــ بہت جلد باطل بھی ان کے خلاف حرکت میں آگیا ـــــ اور حق و باطل کی وہ کش مکش شروع ہوگئی جس کے خطرات

سے گزرے بغیر کبھی حق پسند اس دنیا میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔

بنی اشہل کے سردار سعد بن معاذ کو اس نئی تحریک کی خبر پہنچی اور وہ آگ بگولہ ہو گیا۔ اس نے اپنے ایک تیز مزاج ہرکارے اُسید کو نیزہ دے کر اس ہدایت کے ساتھ روانہ کیا۔

"جاؤ! اور دیکھو کہ یہ مکّے سے آنے والا جوان کون ہے جو ہمارے جوانوں کو گمراہ کیے دے رہا ہے ـــــ جاؤ! اور اس کو زندہ یا مردہ مدینے سے نکال باہر کرو....."

اور ـــــ اُسید اپنی آنکھوں سے چنگاریاں سی اڑاتا ہوا زرارہ منزل میں آدھمکا!

"تو کون ہے اور ـــــ کیا کر رہا ہے؟" وہ گرج کر بولا "جان کی خیر چاہتا ہے تو فوراً چلتا پھرتا نظر آ!....."

مگر کتنے سچے مومن تھے حضرت مصعبؓ بن عمیر جو اس لرزہ خیز دھمکی سے نہ ڈرے اور نہ غصّے میں آئے۔ ان کی آنکھوں سے اس نفرت بھری دھمکی کے جواب میں جو چیز ٹپکی وہ ایک شدید "درد" تھا ـــــ منھ سے پھول سے جھڑے اور حکمت جو مومن کی خاص میراث ہے اس سے کام لیتے ہوئے انھوں نے آنے والے کو مجبور کر دیا کہ وہ بیٹھے اور ان کی بات سُنے ـــــ اُسید نے اپنا نیزہ زمین میں گاڑ دیا اور ہولناک تیوری چڑھائے ہوئے بیٹھ گیا ـــــ ادھر حضرت مصعبؓ بن عمیر نے انتہائی پرسوز آواز میں اس کو قرآن شریف کی چند آیات سنانا شروع کیں۔ سننے والے کی حالت تیزی سے بدل رہی تھی ـــــ چڑھی ہوئی تیوری اُترنے لگی ـــــ دردناک جذبات چہرے سے نمایاں ہوئے اور ابھی ابھی جن آنکھوں سے خون ٹپک رہا تھا ان میں آنسو چھلک پڑے ـــــ اسید کا دل اس کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا اور دوسرے ہی لمحے وہ ایمان و اسلام کی آغوش میں تھا۔ پھر اسی اُسید کو جسے کفر نے بھیجا تھا اب اسلام نے کفر کی طرف روانہ کیا کہ وہ کسی طرح قبیلے کے سردار کو یہاں تک کھینچ لائے ـــــ چنانچہ سعد بن معاذ بھی آئے اور اس نوائے حق سے مسحور ہو کر گئے۔ شام ہوتے ہوتے پورے قبیلے کے دلوں کو مصعبؓ بن عمیر کے سوز دروں

نے اسلام کی گود میں کھینچ لیا تھا ـــــ اور اس طرح بہت جلد پورا مدینہ اسلام کے مفتوح شہر میں تبدیل ہو کر رسولؐ خدا کے لیے چشم براہ ہو گیا۔

لیکن اس خاموش جہاد میں کفر و شرک کی ذہنی صفیں کی صفیں الٹ دینے کے بعد بھی مصعبؓ بن عمیر محسوس کرتے تھے کہ ابھی خدا کی بارگاہ میں وہ بندگی کا حق کہاں ادا کر سکے! ـــــ چنانچہ بدر و اُحد کے میدانوں میں وہ باطل سے مسلح جنگ کرنے کے لیے نکلے اور اُحد کے میدان میں ان کی جان عزیز بھی جان آفریں کے کام آ گئی۔

اس جنگ میں اسلام کا پرچم ان کے ہاتھ میں تھا۔ دشمن کی تلوار ان کے اسی بازو پر گری اور ہاتھ کٹ گیا مگر جھنڈا نہیں گرا ـــــ وہ اب ان کے دوسرے ہاتھ میں تھا انھوں نے دیکھا کہ ایک ہاتھ سے وہ ایک ہی کام کر سکتے ہیں ـــــ یا جھنڈا پھینک کر جان کی حفاظت میں تلوار چلائی جائے یا تلوار پھینک کر جھنڈا بلند رکھا جائے۔ تھوڑی دیر اور اس جھنڈے کو بلند رکھنا ان کو اس دنیا میں جینے رہنے سے کہیں زیادہ پیارا تھا ـــــ زندگی طوفانی جذبات کے اشاروں پر بجلی کی طرح حرکت میں تھی ـــــ جھنڈا اونچا اٹھا ہوا تھا ـــــ اور بازو شہید ہونے کے انتظار میں تھا۔ دشمن کی تلوار ایک بار پھر چمکی اور وہ بازو بھی کٹ گیا ـــــ مگر کٹے ہوئے بازوؤں نے جھنڈے کو سینے سے لپٹانے کی ایک مجنونانہ کوشش اور کی ـــــ دشمن کا بھالا حرکت میں آیا اور مصعبؓ کے سینے سے اس طرح ٹکرایا کہ آدھا نیزہ ٹوٹ کر سینے کے اندر ہی رہ گیا ـــــ اب وہ لڑکھڑائے اور غش کھا کر زمین پر گرے اور ان کے تڑپتے ہوئے جسم پر اسلام کا جھنڈا بھی تڑپتا ہوا گرا.....

اور پھر ـــــ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی خوں آلود نعش کے قریب ہوئے اور مکے کے اس خوب صورت لاڈلے جوان کو راہِ خدا میں خاک و خون میں لتھڑا ہوا پا کر آپؐ کا دل بھر آیا ـــــ آنکھیں بھیگ گئیں اور آواز جذبات سے کانپنے لگی۔

"مصعبؓ!" آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے شہید کی روح کو آواز دیتے ہوئے کہا۔ "مصعب! میں نے تمھیں مکے میں دیکھا تھا کہ تم جیسا حسین و خوش پوشاک کوئی

نہ تھا ـــ آج دیکھتا ہوں کہ بال بکھرے ہوئے ہیں اور جسم پر صرف ایک چادر ہے۔"
یہ کہتے کہتے آپؐ جوش میں آ گئے اور اعلان کیا:
"خدا کا رسول گواہی دیتا ہے کہ قیامت کے دن خدا کی جناب میں تم بڑے اعزاز کے ساتھ حاضر کیے جاؤ گے"۔ اور آہ! وہ چادر! جو اتنے عظیم جسم کا کفن بھی پورا نہ بن سکی۔ سر ڈھکتے تھے تو پاؤں کھل جاتے تھے اور پاؤں ڈھکتے تھے تو سر کھل جاتا تھا ـــ آخر پاؤں پر گھاس ڈالی گئی اور اس طرح یہ جوان شہید سپردِ خاک کیا گیا۔

کتنا قابلِ رشک تھا وہ مومن جس کے ایمان پر اللہ کے رسولؐ نے اس طرح گواہی پیش کی ہو! ـــ اور ـــ کس قدر رونے کے لائق ہیں وہ ہمارے "ایمان" جن کے لیے خود ہمارے دل بھی گواہی دیتے دیتے کسی خوف سے چپ ہو جاتے ہیں! کل جب میدانِ حشر میں خود خدا گواہی دے رہا ہوگا کہ یہ میرے سچ مچ میرے بندے تھے اور جب اشک و لہو میں نہائے یہ جسم خداوندی لطف و اعزاز سے سرفراز کیے جا رہے ہوں گے خدا جانے ہم کہاں ہوں گے اور کس حال میں ہوں گے۔!

اے لوگو! کبھی تو سوچو ـــ کسی پل تو غور کرو کہ انجام کیا ہونا ہے ہمارا ـــ ہم کس منھ سے اس آقا کے سامنے جائیں گے جس کی بے حد و نہایت نعمتوں کا تشکر ہم اتنا بھی تو نہ کر سکے جتنا ایک کتّا اپنے مالک کا کرتا ہے۔ خدا کی خاطر سر دینا اور سینے پر زخم کھانا تو بڑی چیز ہے ہم تو بے حیائی اور سرکشی کی اس انتہا سے بھی خود کو نہ بچا سکے جہاں جرم و گناہ کا احساس ہی مٹ جاتا ہے اور انسان کی حیثیت جانوروں سے بھی بدتر ہو جاتی ہے۔

ہم حنفی ہیں ـــ اہلِ حدیث ہیں، حنبلی اور شافعی ہیں۔ ہم اہل السنت والجماعۃ ہیں۔ سبھی کچھ ہیں مگر نہیں ہیں تو وہ سادہ دل "مسلمان" نہیں ہیں جو ہر آن اپنے اندر یہ تڑپ محسوس کرتا رہتا ہے کہ کلمۂ توحید زبان سے نکالا ہے تو اس کا حق بھی کسی طرح ادا

کر کے رہیں ـــــ ہائے یہ کلمۂ توحید ـــــ جس کے معنی کا اگر حقیقی احساس آدمی کے اندر پیدا ہو جائے تو پھر وہ حق و باطل کے میدان جنگ میں دیوانہ وار کود پڑتا ہے اور جب اس کا بدن زخموں سے چور ہو کر روح کو الوداع کہنے لگتا ہے تو دل کی گہرائیوں سے صدا بلند ہوتی ہے کہ اے پروردگار! ایسی ہی زندگی آپ اگر ہزار بار عطا کریں تو یہ غلام اسے اسی طرح آپ کی راہ میں قربان کر دے گا۔

"ایمان" ـــ ایک سخت آزمائش۔ ایک عظیم کامیابی

حضرت بلالؓ بن رباح مسلمان ہونے سے پہلے محض ایک حبشی غلام ہی تو تھے ـــ ایک بے حیثیت وجود جس کی دکھ بھری زندگی اس وقت تک ہر لحاظ سے ایک سیاہ رات تھی ـــ انسانی غلامی کے اس دور میں ان کے پاس کچھ نہیں تھا۔ کچھ بھی تو نہیں!

سراپا اخلاص و وفاداری ـــ

ہمہ تن بے چارگی و بے بسی ـــ

دنیا کے ٹھاٹ باٹ اور دولتِ ظاہری سے یکسر خالی ہاتھ!

مگر یہ بات اس وقت تک کی ہے جب تک وہ ایک آدمی کے غلام تھے۔ اُمیّہ بن خلف جیسا کافر و مشرک ان کے اوپر آقائی کر رہا تھا جس کی آقائیت بلالؓ بن رباح کو دو روٹیوں اور دو چیتھڑوں کے عوض ان سے ان کی ساری انسانیت کے حقوق خرید لینا چاہتی تھی لیکن یہ المیہ کوئی نئی بات نہیں ـــ باطل کی آقائی نے تو ہمیشہ یہی کھیل کھیلا ہے ـــ ہمیشہ یہی کھیل کھیلتی رہے گی۔ خدا فراموش انسانی غلامی کی رسم نے خدا کے بندوں کو اسی طرح لوٹا ہے ـــ ہمیشہ اسی طرح لوٹا ہے۔

زندگی کے اسی خوں چکاں دور میں بلالؓ نے محمدؐ کی نئی آواز سنی!

"خدا کے سوا کوئی اور خدا نہیں۔"

کرب غلامی سے گھائل روح کو اس آواز نے چونکا دیا ـــــ جھنجھوڑ ڈالا ـ
انھیں پہلی بار اس حقیقت کا سنسنی خیز احساس ہوا کہ آقا امیہ بن خلف اور غلام
بلال بن رباح دونوں برابر ہیں ـ دونوں غلام ہیں ـــــ ایک ہی خدا کے غلام !ـ
اس احساس حقیقت نے بلال کی روح میں ایک طرف عبودیت کا سوز بیکراں
بھر دیا ـ دوسری طرف غیرتِ انسانیت کے شعلے کوٹ دیئے ـ یہ آواز یقین و ایمان
کی برقی لہر کی طرح آئی ـ ان کے قلب و روح میں سرایت کر گئی اور ٹھیک اس وقت جب
وہ اپنے خدا کے قدموں پر جھک رہے تھے ان کے جسم و جان بندوں کی بندگی اور غلاموں کی
غلامی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بیزار اور آزاد ہو رہے تھے ـ سر سے پاؤں تک غلامی کی آہنی
زنجیروں میں جکڑا ہوا انسان بے اختیار پکار اٹھا اور "غلامی" کی تمام زنجیریں چھن چھنا کر ٹوٹ
گریں ـــــ

"خدا کے سوا کوئی اور خدا ہے ہی نہیں ـــــ نہیں ہے ـــــ ہرگز نہیں ہے ـ"

اور ـــــ
اسی دم وہ آدمی جو ایک حبشی غلام تھا ان لوگوں کے لیے "سیدنا بلالؓ" ہو گیا
جن کے سینے روشن اور آنکھیں بھیگی بھیگی تھیں ـــــ

"خدا کے سوا اور کوئی خدا نہیں !"

ہائے یہ الفاظ ! ـــــ یہ چند الفاظ !!
کیا یہ محض چند کھوکھلے لفظ ہیں جو زبان کی چند جنبشوں سے بن جاتے اور ہوا کے
ایک جھونکے سے تحلیل ہو کر فنا ہو جاتے ہیں ؟ اگر واقعی ایسا ہی ہوتا تو پھر ایسا کبھی نہ ہوتا کہ
ان الفاظ پر خون حیات کا ایک ایک قطرہ ٹپکا دینے، دل کی ایک ایک دھڑکن لٹا دینے اور
عمر کا آخری سانس تک نذر کر دینے کے بعد بھی ان الفاظ کو منھ سے نکالنے والے یہ کہتے
ہوئے دنیا سے جاتے کہ ہم سے ان الفاظ کا حق ادا نہیں ہوا ـ کیسے ہوش باختہ ہیں وہ
دیوانے جو اس خوفناک دھوکے کے سہارے جینا چاہتے ہیں کہ ہمیں بس اتنا کہنے پر
ہی چھوڑ دیا جائے گا کہ "ہم ایمان لے آئے" اور ہمیں کسی آزمائش میں ڈالا نہ جائے گا!

بلالؓ نے یوں نہیں سوچا تھا ـــــ انھوں نے بستر پر لیٹ کر نہیں، جان ہتھیلی پر رکھ کر یہ کلمہ پڑھا تھا اور اسی لیے ان کو خدا نے خوب خوب ہی آزمایا "سیدنا بلالؓ، بننے سے پہلے ـــــ اس سے پہلے کہ جنت یہ آرزو کرتی کہ اس مشتِ خاک کے قدم میرے فرش لالہ و گل پر پڑیں، بلال کو سالہا سال تک انسانی اذیت کے کانٹوں پر گھسیٹا گیا اور جلتی ہوئی ریت میں ڈال کر بے رحمی کی ٹھوکروں سے روندا گیا۔ یقیناً یہ ایک ناقابلِ برداشت تکلیف تھی مگر ظلم و ستم کی مسلسل یلغار میں وہ ایک گھٹی گھٹی چیخ جو اس وقت بھی بلال کے خشک اور جلتے ہوئے ہونٹوں سے بلند ہوتی تھی اس میں یہ الفاظ صاف سنائی دیتے تھے۔

"خدا ایک ہے ـــــ مجھے مار ڈالو مگر خدا ایک ہے ـــــ اَحَدٌ ـــــ وحدہٗ لا شریک لہٗ"۔

جلتی ہوئی ریت کی چنگاریوں پر سیدھا لٹا کر۔
جھلستے ہوئے سینے کو منوں کی پتھریلی سِل سے کچل کر ـــــ
کافروں کے جھنڈ کے جھنڈ ایک بلالؓ سے کہا کرتے تھے "ہمارے خداؤں کو مانو!"
"احد! احد! احد! احد! ـــــ ایک!۔ ایک!۔ ایک!۔ ایک۔" خدا کی قسم! یہی تھا حضرت سیدنا بلالؓ کا بیقرار آہنگ! ـــــ درد و کرب کا احساس کہیں چلا نہیں گیا تھا۔ مگر جس کا دل ایمان سے چمک اٹھا ہو اس کے ہونٹوں سے کراہ بھی نکلتی ہے تو ایمان کی تب و تاب لیے ہوئے۔

رات کی تاریکی میں ان کو زنجیروں کے کساؤ گھائل ہی کر ڈالتے ـــــ رات بھر یہ زنجیریں گوشت میں پیوست ہوا کرتیں ـــــ اور رات اسی طرح آنکھوں میں کٹ جاتی صبح کی روشنی میں ان زخموں کو اُدھیڑ ڈالنے کے لیے تڑاتڑ کوڑوں کی مار دی جاتی۔ نیلی نیلی رگیں اُبھرتیں پھٹ جاتیں اور خون دینے لگتیں۔ پھر رات بھر کے لیے اس زخموں سے چور مومن کو زنجیروں میں اینٹھنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا۔ پہاڑ سی رات اسی

عالم میں کٹ جاتی کہ ظالم تازہ دم ہونے کے لیے میٹھی نیند میں خراٹے لیتے اور مظلوم کرب ناک زخموں اور کانٹوں پر کروٹ بھی نہ بدل سکتا! دوسرے دن کا سورج دیکھتا کہ اس بلاکشِ حق و صداقت کو گرم گرم بالو کے بھاڑ میں بے تحاشا جھونک دیا جاتا۔

"اب بھی کہہ دے خدا ایک نہیں .....! کفر و شرک کے انسانی درندے اس کے اوپر جھکتے اور چلاتے۔

زخموں اور کرب و درد میں ڈوبی ہوئی تہ نشین آواز پھر سینے سے اُبھرتی اور "احد! احد! احد! احد!" کا والہانہ آہنگ جوں کا توں سنائی دیتا۔ ظلم و سفاکی تھک ہار کر بیٹھ جاتی اور بلالؓ کی آواز کو کسی طرح خاموش نہ کر پاتی ــ ہاں ہاں ــ کبھی بالکل ایسا ہی تھا کہ ہزاروں ستم گر مل کر بھی کسی ایک بلالؓ کی آوازِ حق کو نہ دبا سکتے تھے۔ مگر اب کروڑوں مسلمانوں کے سینوں میں بھی اس آواز کی کوئی دھمک سنائی نہیں دیتی۔ ہم کروڑوں میں بھی ایک بلالؓ کی ایمانی طاقت نہیں ــــ اور ہم اپنے ایمان کی اس نامعلوم ترین رمق پر کس اطمینان سے بیٹھے ہیں ــ پاؤں پسارے سو رہے ہیں۔ دن میں اکڑ اکڑ کر زمین پر چل پھر رہے ہیں ــ اے لوگو! یہ ہمیں کیا ہوا ہے؟.....

ایک کھیل ایک حقیقت

"آج میں ابوبکر سے وہ کھیل کھیلوں گا جو کسی نے کسی سے نہ کھیلا ہوگا!!"

امیہ بن خلف نے ایک وحشیانہ قہقہہ کی گرج کے ساتھ اپنے ساتھیوں سے کہا۔ وہی اُمیہ جس کے غلام حضرت بلالؓ حبشی تھے۔ جس نے شروع میں بلال کے دعوۂ ایمانی کو ریت کا محل اور بچوں کا ایک کھیل سمجھ رکھا تھا ــــ جس نے ایک "غلام" کے نغمۂ توحید کو کچل ڈالنے کے لیے بدترین مشق ستم کی اور ــــ پھر بھی وہ روح ایمانی جب وہی نغمہ ــ لہو رنگ نغمہ جبر و عقوبت کی خوف ناک فضاؤں میں مسلسل الاپتی چلی گئی تو بے رحم و

جابر آقا کی ساری آقائیت حیرت اور جھنجھلاہٹ کے غلیظ پسینے میں غوطے کھانے لگی!

"تو کیا ارادے ہیں آخر؟" لوگوں نے خاص دل چسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"تم جانتے ہو" اُمیّہ بن خلف کی دونوں آنکھوں میں وحشت و عیّاری کی دو آتشہ چمک کوندنے لگی "تم جانتے ہو کہ بلال میرا غلام ہے اور غلام کی حقیقت ہوتی ہی کیا ہے! — پھر جب سے اس نے اَحَدٌ! اَحَدٌ! کی رٹ لگانا شروع کی ہے میرے لیے وہ سیاہ گوشت کا ایک نفرت انگیز ڈھیر بن کر رہ گیا ہے۔"

"ہوں!"

میں نے کہا تھا کہ میری پہلی ہی جھڑکی میں اس کے اس نئے دین کا بھوت اُتر جائے گا۔ مگر نہیں اُترا — پھر میں نے کون سا ظلم ہے جو اس کے اوپر نہیں کیا؟ — آتشیں ریت کے تنور میں ڈال ڈال کر میں نے اس کے مذہب کو بھسم کر دینا چاہا — پھر اس کے سینے پر بھاری چٹان بھی رکھ کر دیکھی — پھر سنگریزوں کے اوپر اس کے جسم کو گھسیٹ گھسیٹ کر کوڑے بھی برسائے۔ مگر کیا وہ اپنے مذہب سے ہٹ سکا؟

"اُف! محمدؐ کا یہ جادو! — اسے اتارنا میرے بس کی بات نہیں۔"

"مگر تم تو ابوبکر سے کوئی کھیل کھیلنے کی بات کر رہے تھے۔" لوگوں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہاں!" اُمیّہ بن خلف غرایا۔ "ہاں — یہ کھیل بھی تم دیکھ لوگے! — کیا یہ بات دل چسپ نہیں کہ ابوبکر کو اس حبشی غلام کے سیاہ فام گوشت پر محبت آرہی ہے!"

امیّہ بن خلف کا ایک وحشت ناک قہقہہ بلند ہوا۔

"وہ کہتا ہے"۔ وہ پھر بولا۔ "وہ کہتا ہے کہ یہ حبشی غلام میرا بھائی ہے۔ وہ اس کو ہر قیمت پر میرے ظلم و ستم کے چنگل سے نکالنے کے لیے بے چین ہو رہا ہے۔"

"تو اس میں کھیل کھیلنے کی کیا بات ہوئی؟" لوگوں نے پھر چھیڑا۔

"کھیل ؟" امیہ بن خلف جھلّا کر بولا "سیاہ گوشت کے ایک گھناؤنے ڈھانچے کا یہ مول تول کیا کوئی کھیل نہیں ؟ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ ابوبکر اس بے کار چیز کی کتنی بڑی قیمت چکانے کی ہمت رکھتا ہے ـــــ میں اس کو اس غلام کی قیمت کے بڑھتے چڑھتے مطالبات سے پسینے پسینے کر ڈالوں گا ـــــ بھاگ پڑنے پر مجبور کر دوں گا ـــــ یا پھر سیاہ خون کے بدلے مجھے وہ چمکتی دمکتی چیز ہاتھ آئے گی ـــــ سونا! ـــــ سونا!! ـــــ سونا!!!" ـــــ کیسا عجیب کھیل! جس میں ہر رخ سے ابوبکر کی ہار یقینی ہے اور میری جیت!! ـــــ ہا ہا - ہا ہا -"

"اچھا!" لوگ کھلکھلا کر ہنسے ـ "اچھا تو یہ بات ہے! ـــــ بلال کی سخت جانی کے بعد اب ابوبکر کی ہمدردیوں پر مشقِ ستم ہوگی! ـــــ"

"ہاہاہا! ـــــ ہاہاہاہا!" امیہ بن خلف کا قہقہہ کسی بدروح کی بے ہنگم چیخ پکار کے انداز میں گونجتا رہا ـ

گرم گرم بالو کی چنگاریوں پر بلال حبشیؓ کے جسم کو بھونا جا رہا تھا ـــــ پتھروں کے اوپر گھسیٹا جا رہا تھا ـــــ کوڑے لگاتار پڑ رہے تھے ـ

"اَحَدٌ! ـــــ اَحَدٌ!!" بلال کی کراہ تھی ـــــ ابوبکرؓ نے یہ آواز سنی ـــــ بے قرار ابوبکر تیزی سے جھپٹے جیسے بلالؓ کی مظلومیت کی ساری ٹیسیں ـــــ تمام درد ابوبکرؓ کے قلب میں سمٹ آیا ہو ـ وہ سچ مچ تڑپ اُٹھے تھے ـ

"کیا اس غریب کے سلسلے میں تجھے خدا کا بھی ڈر نہیں!" ابوبکرؓ نے بلالؓ کی حالتِ زار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امیہ سے پوچھا ـ

"اس کے تمام دُکھ درد کی ذمہ داری خود تم لوگوں پر ہے ـ" اُمیہ نے چڑھ دوڑنے کے انداز میں کہا:

"تم نے ہی اس کو بگاڑا اور پھر اس حالتِ زار تک پہنچنے پر مجبور کیا ـــــ اب اس کو بچا کر دکھاؤ ـــــ بتاؤ اسے خریدتے ہو؟ ـ بولو!"

"ہاں" حضرت ابوبکرؓ بلالؓ کی نجات کے لیے بیکل ہوتے ہوئے بولے۔ "ہاں میں تیار ہوں ـــ ہر قیمت پر!"

"کیا قیمت دوگے؟" امیہ نے تیکھی نظروں سے دیکھا۔

"قسطاس!" ابوبکرؓ نے چھوٹتے ہی کہا ـــ "میرا مضبوط، چست قوی غلام قسطاس! جس کے کفر سے میں اس طرح بے زار ہوں جس طرح تم بلالؓ کے ایمان سے! ـــ مجھے بلالؓ سے محبت ہے ـــ تمھیں قسطاس سے محبت ہونی چاہیئے۔"

ایک غلام سے محبت کرنے کی بات سنتے ہی اُمیہ بن خلف نے بہت برا منھ بنایا ـــ کچھ سوچا اور پھر فوراً بولا:

"منظور ہے!"

لیکن اچانک پھر فوراً ہی اُمیہ بن خلف نے جگر خراش قہقہہ مارا ـــ

"نہیں! خدا کی قسم!" وہ ہنستے ہوئے بولا اور اس کی آنکھوں میں شیطنت کی بجلیاں کوندرہی تھیں۔ "قسطاس ہی نہیں، اس کی بیوی بھی دینا ہوگی! ـــ اس کی بیوی بھی دینا ہوگی!"

"مجھے منظور ہے۔" ابوبکرؓ نے ایک لمحہ پس و پیش کے بغیر فرمایا۔

لیکن اچانک پھر وہی قہقہہ!

"نہیں! خدا کی قسم!" اس نے قہقہہ مارتے ہوئے ساری گفتگو پر پانی پھیرتے ہوئے کہا۔ "قسطاس اور اس کی بیوی کے ساتھ اس کی بیٹی بھی لوں گا!"

"اوہ ـــ بیٹی ـــ"

"ہاں ـــ اس کی بیٹی ـــ"

ابوبکرؓ نے ایک ثانیے سوچا۔ پھر دو ٹوک لہجے میں بولے۔ "چلو دی۔"

لیکن ایک بار پھر اُمیہ بن خلف نے ہولناک قہقہہ بلند کیا:

"نہیں! ـــ خدا کی قسم! ـــ قسطاس بھی اور اس کی بیوی بھی، اس کی بیٹی بھی اور دو سو دینار مزید! ـــ بولو! بولو! کیا بلالؓ کو خرید دگے؟"

"شرم!" بار بار زبان بدلنے والے کی شرارت سے بیزار ہو کر حضرت ابوبکرؓ بولے "کیا جھوٹ بولتے ہوئے تجھے شرم و حیا نہیں آتی؟"

"لات و عزیٰ کی قسم!" امیہ بن خلف نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "بس یہ آخری قیمت ہے ـــ پھر بات طے شدہ سمجھو۔"

"چل او کافر مجھے یہ بھی منظور ہے۔" مسلمان بھائی بلالؓ کی غم خواری سے سرشار ابوبکرؓ نے سینہ تان کر کہا ـــ

سودا ختم ہو چکا تھا ـــ ایک عظیم آزمائش میں دونوں مومن کھرے اُترے تھے۔ بلال کی جان اور ابوبکرؓ کے مال پر سے طوفانی آزمائش پوری قوت سے گزری اور دونوں فاتحانہ نکلے! فقط اس لیے کہ "خدا" دونوں کو جان و مال سے زیادہ پیارا تھا۔

یکایک ایک نیا قہقہہ بلند ہوا ـــ لیکن یہ قہقہہ امیہ بن خلف کا نہیں۔ اس کی بیوی کا تھا! جس کے خیال میں بلالؓ کی اتنی بڑی قیمت دے کر ابوبکرؓ معاذاللہ بیوقوف بن گئے تھے۔

ہم تو بلال کو ایک اوقیہ سونے میں بھی بخوشی بیچ ڈالتے!" اس نے کہا۔ "بلالؓ ہمارے لیے ہماری سب سے بے قیمت چیز کے سوا آخر کیا ہے۔"

"کون کسے بتائے کہ بے وقوف کون بنا!" ابوبکرؓ کی روح سے درد سا اٹھا ـــ "بلالؓ میرے لیے اس قدر قیمتی ہے کہ سو اوقیہ بھی قیمت ٹھیرتی تو ابوبکرؓ پیچھے ہٹنے والا نہیں تھا۔"

حضرت ابوبکرؓ کی یہ درد بھری بات ان لوگوں نے سُنی اور ـــ پھر بھی انھیں "بے وقوف" ہی سمجھا۔ اس لیے کہ کفر دنیا کی پرستش کا دوسرا نام ہے ـــ اور دنیا کی بے حد قیمتی چیز سونا چاندی سے بڑھ کر کون سی ہے۔

ـــ لیکن کیا ہم ابوبکرؓ کی یہ بات سمجھ رہے ہیں؟

کیا ہمارے سر میں امیہ بن خلف کا دماغ ہے یا ہمارے سینے میں ابوبکرؓ کا سا دل ہے؟ اللہ اور رسول سے کون ہمیں زیادہ پیارا ہے؟ ـــ اور کیا ہم لوگ ہر لمحہ

اسی امتحان سے نہیں گزر رہے ہیں۔ جہاں سے حضرت ابوبکرؓ اس طرح فاتحانہ گزرے تھے؟ ــــ خدا کے کتنے بندے ہیں جو ہماری دیواروں کے سائے میں بھوک اور افلاس کے شعلوں میں جل رہے ہیں ــــ ہمارے پاس اتنا پیسہ موجود ہے کہ ہم انھیں اس دکھ درد کی جاں ستاں قید سے نجات دلا سکتے ہیں ــــ مگر کیا ہم نے ایسا کیا ہے؟ ــــ کیا ہم ایسا کرنے کا ولولہ رکھتے ہیں۔؟

یہ سوال جواب چاہتا ہے اور جواب ہی یہ بتائے گا کہ ہم اسلام کی غلامی کا دم بھرنے والے سچ مچ اسلام کے غلام ہیں یا ہم نے خود اسلام کو اپنی خواہشات کا غلام اور اپنے مفادات کا آلۂ کار بنا چھوڑا ہے۔ کسی اور سے نہیں خود اپنے سے جواب لو اور پھر اس دن کا انتظار کرو جب فردِ عمل دیکھ کر چیخ پڑو گے کہ یٰوَیْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا۔ (ہائے خرابی! یہ کیسا کاغذ ہے کہ اس نے ہمارے چھوٹی اور بڑی کسی بھی بات کا احاطہ کیے بغیر نہیں چھوڑا۔)

ظلم و ستم کے ان مسلسل زلزلوں میں بلالؓ کو تہ و بالا ہوتا ہوا دیکھ کر کوئی یہ بھی تصور نہ کر سکتا تھا کہ یہ جاں لیوا عقوبت ان کو جیتا بھی چھوڑ سکے گی ــــ پھر یہ کوئی کیسے تصور کرتا کہ جس ظالم آقا کے ہاتھ دن دہاڑے مکّے کی سڑکوں پر بلال کا گلا گھونٹ ڈالنے کی قدرت رکھتے ہیں، اسی "آقا" کو ایک دن اپنے اسی غلام کے ہاتھوں خاک و خون میں تڑپنا ہوگا! ــــ اور درندگی کے طوفان میں اسی "غلام" کی گھٹی گھٹی یہی آواز ایک دن خانہ کعبہ کی چھت سے اذان کا رجز بن کر اٹھے گی تو خدا کے عرش کو چھولے گی۔

بھلا کون تصور کر سکتا تھا!

مگر خدا کی قسم! ــــ واقعات یوں ہی پیش آئے۔ حالات و امکانات کے بالکل برخلاف پیش آئے۔ حالات و امکانات کی بساط الٹ گئی اور خدا کی تقدیر نے تاریخ کے چوراہے پر کھڑے ہو کر ثابت کیا کہ بلالؓ اسی خدا کا غلام ہے جو خدا جس بات

کا ارادہ کرے تو پھر وہ ہو کر ہی رہتی ہے۔

کفر و اسلام کی پہلی ہی جنگ میں خدا نے اُمیّہ بن خلف کی گردن کو بلال رضؓ حبشی کی تلوار کے حوالے کر دیا تھا اور فتح مکہ کی عہد آفریں مہم میں محمدؐ عربی اور بلال حبشی رضؓ ایک ہی ناقہ پر ایک ساتھ سوار تھے اور جب بڑے بڑے مومن کعبہ میں فاتحانہ داخل ہوئے تو کعبہ کی چھت سے پہلی اذان بلند کرانے کے لیے اللہ کی رحمت اور محمدؐ کی نظر اسی سیاہ فام حبشی غلام کو سرخ و سفید اَن گنت چہروں کے درمیان ڈھونڈتی پھر رہی تھی ــــ کفر و شرک نے جس بلال رضؓ کو قدموں سے روند ڈالنے کی کوشش کی تھی اسلام نے اسی بلال رضؓ ــــ اسی حبشی غلام کو سیدنا بلال رضؓ، بنا کر اٹھایا ــــ کعبے کی چھت تک پہنچایا۔ اور اس کے سیاہ ہونٹوں کو اس فخرِ عظیم کے لیے چن لیا کہ کعبے کی پہلی اذان انہیں پر ایک شعلۂ نور بن کر لرزے ایک مورچہ نور بن کر پھوٹے اور ہمیشہ کے لیے فضاؤں اور سینوں میں رواں دواں رہے۔ آج بھی جب روح کے جھروکے سے پرانی یادوں کی خوش گوار ہوا۔ قلب و ذہن کی وادیوں میں داخل ہوتی ہے تو ایک نغمۂ نور نس نس میں بکھرتا چلا جاتا ہے جس کا سرمدی آہنگ دل کی دھڑکنوں میں جذب ہو کر احساس دلاتا ہے کہ بلال رضؓ کی صدائے اذان شرق سے غرب تک جاری پانی کی طرح بہہ رہی ہے۔ اور بہتی رہے گی وہ فقط ایک صدا نہیں تھی۔ لفظوں میں ڈھلی ہوئی روح بلالی تھی جو رہتی دنیا تک فضائے بسیط میں چمکتی رہے گی۔

کیسے تھے وہ لوگ جنھوں نے جی اور جان سے حق و صداقت کی قیمت پہچانی! ہمیشہ ہمیشہ خوشی سے جینے کے لیے اس دنیا ــــ ہاں اس دنیا میں سسکتے رہنا بھی ان کے لیے ایک کھیل تھا۔ انھیں تو آزمائش کی سنگلاخ گھاٹیوں سے جنّت کے باغوں کی خوشبو آئی تھی ــــ اپنے اشک و خون کے سیلاب میں اس یقین کے سہارے تھپیڑے کھا کھا کر وہ مسکرا سکتے تھے کہ اس طوفان کے اس پار ایک ساحل مُراد بھی ہے ــــ جہاں خدا اور خدا کی عبادت نہ جانے کب سے ان کی منتظر و

مشتاق ہے۔

—— اور کیسے ہیں وہ لوگ جو خدا کی جنت کو مفت میں حاصل کرنے کی آرزو بھی اس طرح نہیں کرتے جس طرح سچ مچ کسی چیز کی آرزو کی جاتی ہے!

اذاں ازل سے ترے عشق کا بہانہ بنی
نماز اس کے نظارے کا اک بہانہ بنی

ہوئی اسی سے ترے غم کدے کی آبادی
تری غلامی کے صدقے ہزار آبادی

دو محبوب ترین قطرے

جب خدا کی بارگاہ میں اپنے خطاکار ہونے کا احساس خدا کی عظمت کا احساس دلاتا ہے تو ایک بندے کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو جاتی ہیں ـــــ اور ـــ جب سچائی کو پسند کرتے کرتے انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ اب سچائی اس کی نس نس میں روح بن کر سما چکی ہے تو ٹھیک اسی دم وہ یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ خدا کی زمین پر شیطانی جھوٹ کا ہر ایک وجود اس کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا ہے جس کو نکالے بغیر اس کو چین آ ہی نہیں سکتا ـــــ ہائے یہ زندگی کا بلند ترین اور حسین ترین مقام! ـــ کہ جہاں تلواروں کی چھاؤں میں سونے کی آرزو زندگی کو موت کی تلاش میں آبلہ پا لئے پھرتی ہے ـــــ جب زبان سے "اللہ اللہ" کرنے والا بے چین ہوتا ہے کہ اس کے لہو کی ہر بوند سے یہی آواز آئے اور اسی حسین "نام" کو اس کے خونِ حیات کے قطرے زمین کے ایک ایک ذرّے کے سینے پر نقش کر ڈالیں۔

آہ ـــ یہ دو قطرے!

کتنے قیمتی، کس قدر مقدس!!

جن میں سے ایک پانی ہے اور دوسرا لہو ـــــ مگر دونوں میں ایک ہی بندگی کی تڑپ اور ایک ہی سپردگی کا درد نور کے شعلے کی طرح کپکپا رہا ہے۔ شاید اسی لیے خدا نے دونوں کی قیمت ایک ہی ٹھیرا دی ـــــ مرحبا یہ دو محبوب ترین قطرے! ـــ دو عظیم ترین تحائف جن سے خدا کو پیار ہے۔ اور ـــــ

کیسا قسمت کا دھنی تھا وہ عمار بن یاسرؓ کہ جس نے اللہ کی بارگاہِ جمال و جلال میں یہ دونوں ہی محبوب تحفے نذر کیے!

ان کی زندگی اشک و خون کے اسی دو رُخی جذب و جنون میں والہانہ وجد کرتی

ہوئی اٹھی ـــــ صراطِ مستقیم کے نشانات اپنے خونیں آنسوؤں سے نکھارتی ہوئی چلی اور پھر ہمیشہ کے لیے ایک سجدۂ شوق بن کر اللہ کے سنگِ آستاں میں جذب ہو گئی۔

وہ حضرت یاسرؓ کے بیٹے تھے ـــــ وہی بوڑھے یاسرؓ جنھوں نے اللہ اور اس کے رسول کے لیے جوانوں کی طرح زخم پر زخم کھائے تھے۔ ہائے وہ بوڑھی کھال جس کو بنی مخزوم کے ظالمانہ کوڑوں کی شائیں شائیں نے اُدھیڑ ڈالا تھا، مگر اللہ اکبر! وہ بوڑھا ضعیف چہرہ جس کی آنسو اور خون ٹپکاتی جھریوں نے غیرتِ ایمانی کی آبرو پر حرف نہ آنے دیا تھا۔ ہاں ـــــ عمارؓ اسی باپ کے بیٹے تھے اور انھوں نے اس سمیہؓ کا دودھ پیا تھا جس نے نسوانیت اور بڑھاپے کی دُہری کمزوریوں کے درمیان کھڑے ہو کر اسلام میں سب سے پہلے جان کا نذرانہ بارگاہِ ربانی میں پیش کرنے کی مقدس رسم نکالی تھی!

جس وقت آلِ یاسرؓ پر ظلم و ستم کی قیامت ٹوٹی پڑ رہی تھی ـــــ جب حضرت یاسرؓ کا بڑھاپا آتشیں زنجیروں میں جکڑ ڈالا گیا تھا جب ان کی بوڑھی شریکِ زندگی حضرت سمیہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا ٹھوکروں اور کچوکوں، شعلوں اور زنجیروں کے درمیان سے گزرتی ہوئی جان والے پر جان دینے کی ریت ڈالنے کے لیے اسلام کی پہلی شہادت کا افتتاح کرنے جا رہی تھیں ـــــ جب ان بوڑھے ماں باپ کا جواں سال عمارؓ ظلم و استبداد کے آخری شکنجوں میں کسا جا رہا تھا ـــــ اُس وقت وہ عاشقانِ پاک طینت لہو کے فواروں اور آنسوؤں کی موسلا دھار برسات میں یکایک فرطِ مسرت سے مسکرا اٹھے ـــــ صرف اس لیے کہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ان بے کسوں کے پاس سے یہ کہتے ہوئے گزر گئے تھے:

"صبر کرو اے آلِ یاسرؓ! وعدہ ہے کہ تم سے ملاقات جنت میں ہو گی....."

سمیہؓ کی روح پر وجد طاری ہو چکا تھا ـــــ تکلیف کی شدت سے جب زبان اینٹھ گئی تھی وہ ظالموں سے کہہ رہی تھیں کہ "خدا ایک ہے ـــــ خدا کی قسم!"

بوڑھے ماں باپ نے اسلام پر جانیں نثار کر دیں اور جواں سال عمارؓ اس لیے زندہ رہے تاکہ ہجرت و جہاد کے حوصلے نکالنے کے بعد شہید ہوں۔

سوچیے تو سہی! کتنا پاکیزہ اور ستھرا تھا وہ خون جو عمارؓ بن یاسرؓ کی رگوں میں گردش کر رہا تھا!

ظلم و ستم نے جب سچائی کے نام لیواؤں کے خلاف آگ اور خون کے طوفان اُٹھا رکھے تھے تو عمارؓ نے انہی آندھیوں میں اپنے ایمان کی شمع جلائی تھی۔ یہ آندھیاں اور یہ بگولے اس چراغ کو گل نہ کر سکے۔ انھوں نے نوخیز جوانی کے سینے پر خدا کے لیے زخم پر زخم کھائے۔ انتہائی بے رحم اور خون خوار انسانوں کی بھیڑ میں حضرت عمارؓ وہی بات کہے چلے جا رہے تھے جسے سننا خدا کے باغیوں نے کبھی پسند نہیں کیا اور اس کے جواب میں ہمیشہ پتھر ہی برسے۔

"کوئی بھی معبود نہیں۔ معبود تو فقط اللہ ہے۔"

آخر ظلم بڑھتے بڑھتے قیامت میں بدل گیا۔ مصائب اور آفات کی قیامت خیزیوں نے ہوش و حواس کی بساط ہی الٹ کر رکھ دی۔ انھیں کھولتے ہوئے پانی میں غوطے پر غوطے دیئے گئے اور ـــــ آہ! کرب و اضطراب کا وہ آخری موڑ آ پہنچا جب قوتِ برداشت اپنی ساری توانائی ختم کر کے خشک لکڑی کی طرح ٹوٹ جاتی ہے۔ یہی تھا وہ مقام جہاں قطعاً بے اختیار حضرت عمارؓ کے منہ سے کچھ ایسے الفاظ کہلائے گئے جن کے اوپر تو کفر تھا مگر اندر ایمان ہی ایمان۔

ان الفاظ کے ساتھ وہ قیامت تو اچانک رک گئی جو جسم پر ٹوٹ رہی تھی لیکن اب عمارؓ کی روح کے اندر سے ایک عظیم ماتم کا شورِ قیامت اٹھا۔ یہ خوف اپنی خوفناکی میں سکراتِ موت سے بھی آگے نکل گیا تھا کہ کیا یہ زبردستی کہلائے گئے بے اختیار الفاظ ان کی ایمانی زندگی کا گلا تو نہیں گھوٹ گئے؟ ـــــ کیا انسانی اذیت سے نکلنے کے لیے وہ اب خدائی عذاب کے آتشیں غار میں گر کر پاش پاش

ہو جانے والے تو نہیں ؟

وہ رو دیئے ۔ روتے رہ گئے ـــــ ہچکیوں اور سسکیوں میں ہچکولے کھاتے ہوئے وہ جب غم واندوہ سے پارہ پارہ ہو رہے تھے تو اچانک انھیں حضورؐ کا خیال آیا ـــ وہ بیتابانہ اُٹھے اور گرتے پڑتے اس ہستی کی طرف دوڑے جو آدمی کو دوزخ کے الاؤ سے نجات دلانے کے لیے آئی تھی ۔ وہ دوڑے جا رہے تھے اور ان کا بے قرار دل ان سے بھی آگے اس اضطراب میں سینے سے باہر نکلا جا رہا تھا کہ خدا جانے بارگاہِ رسالت میں ان کی زندگی کے اس نازک ترین مقدمے کا کیا فیصلہ صادر ہوتا ہے !

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی نظروں کے سامنے ـــــ اپنے اس قدر نزدیک پاکر یکایک ان کا کلیجہ منھ کو آنے لگا ، دونوں طرف خاموشی طاری تھی ۔ ایک طرف شفقت تشویش اور تعجب میں ڈوبی ہوئی خاموشی ! ـــــ دوسری طرف وہ خون کے آنسوؤں سے لبریز خاموشی جو ایک ایسے سینے کے اندر سے اُبلتی ہے جس میں دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہو ۔ یہ عمارؓ کی خاموشی تھی ـــــ ندامت و شرمندگی سے پسینہ پسینہ ـــــ درد و اضطراب سے لہولہو ـــــ خوف واندیشہ سے اشک اشک ! ـــــ وہ اس طرح رو دیئے جیسے اُن کی ساری دنیا لٹ چکی ہو جیسے اب ان کے پاس ان آنسوؤں کے سوا کچھ بھی باقی نہ رہ گیا ہو ۔ انھیں خدا کے قہر کا خوف رُلا رہا تھا ۔ مگر انھیں کیا خبر تھی کہ ٹھیک اسی دم رحمت کے ہزارہا فرشتے ان آنسوؤں کو اپنی پلکوں سے چُن لینے کے لیے اپنے پَر پھیلا رہے ہیں ۔ کتنا خوش قسمت ہے وہ رونے والا جس کے آنسوؤں پر خدا کی رحمت کو پیار آجائے !

"دل کا حال کیا ہے ؟ ....." عمارؓ کا فسانۂ غم سُن کر دکھیاروں کے بہترین مونس وغم خوارؐ نے پوچھا "تم اپنے دل کو کیسا پا رہے ہو ؟"

"میرا دل ؟!" عمارؓ نے سسکتے ہوئے سینے کو لرزتے ہوئے ہاتھوں سے تھام کر والہانہ جذب وجنوں کے عالم میں کہا ۔ "میرا ..... دل ..... ایمان پر قطعاً مطمئن ہے اے خدا کے رسولؐ ! ..... میرا دل ..... ایمان پر ..... بالکل مطمئن ہے ....."

اور ـــ دوسرے ہی لمحے عمارؓ رحمت اللعالمینؐ کی آغوش میں تھے ـــ بیتابانہ حضورؐ نے ان کو اپنی مقدس باہوں میں لے لیا تھا ـــ اور اپنے دامن سے ان کے آنسو پونچھ ڈالے تھے۔ وہ آنسو یقیناً خدا کے محبوب قطرے ہی ہوں گے جنھیں محمدؐ کے دامن نے خشک کیا، اپنے اندر جذب کیا ـــ

"کوئی بات نہیں!..... کوئی بات نہیں!!....." حضورؐ آنسو پونچھ رہے تھے اور دل فگار مومن کو تسلّی پر تسلّی دے رہے تھے جسے اس وقت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا دنیا کا کوئی انسان تسلّی نہیں دے سکتا تھا۔

یہ پشیمانی کے آنسو ـــ خدا کے یہ محبوب قطرے انھوں نے اپنی جوانی میں پیش کیے تھے۔ اس کے بعد ان کے باطن پر رحمتِ الٰہی کی گھٹائیں جھوم جھوم کر اس طرح برسیں کہ ان کا ایمان ہمیشہ جوان و تازہ دم رہا ـــ وہ اس وقت بھی جوان رہا جب عمارؓ خود بالکل بوڑھے ہو چکے تھے۔

یمامہ کے معرکۂ جنگ و جہاد میں ان کے ایمان کی جوانی کی یہ شان دیکھنے کے قابل تھی۔ نفاق و ارتداد کی ناپاک طاقتوں کے انتہائی خوف ناک ریلے میں جب مجاہدینِ اسلام کے قدم اکھڑنے لگے تو عمارؓ کے ایمان کی عظیم حرارت چنگاریاں اڑاتی ہوئی اٹھی اور سیکڑوں سینوں کو اچانک جوالا مکھی بنا چھوڑا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ عمارؓ جن کا ایک کان کٹ کر محض ٹنگتا رہ گیا تھا، کھڑے پکار رہے ہیں:

"میں عمار بن یاسر ہوں! ـــ کیا تم لوگ جنت سے بھاگ رہے ہو! ـــ میں عمار بن یاسر ہوں ـــ کیا تم خدا کی جنت سے بھاگتے ہو.....؟"

حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ کا کہنا ہے کہ یہ منظر ایک عجیب منظر تھا ـــ میں کبھی ان کا نعرۂ مستانہ سنتا تھا اور کبھی ان کا خون آلود کان دیکھتا تھا جو بس ذرا سی کھال سے لٹک رہا تھا ـــ اور جس کی کوئی پروا اس سرفروش مجاہد کو اس وقت نہیں

تھی۔ جب کہ اسلام کی آبرو خطرے میں تھی۔

۹۴ سال کی عمر تھی جب عمارؓ نے خدا کی بارگاہ میں خدا کے دوسرے محبوب قطرے ـــــ خونِ حیات کے آخری قطرے بھی پیش کر دیئے۔ یہ بات تو ان کو ہجرت کے بعد ہی حضورؐ کی زبانی معلوم ہو چکی تھی کہ ان کے نامۂ اعمال میں ان کی شہادت کا عظیم باب بھی ہے ـــــ لیکن اس شرف تک پہنچنے میں کیسی عظیم آزمائش ذہنی و روحانی آزمائش کی گھاٹی پیش آئے گی، اس کا کوئی علم انھیں نہیں تھا۔ یہ بات انھیں اس وقت معلوم ہوئی جب حضرت علیؓ کے دورِ خلافت میں جنگ جمل کا میدان گرم ہوا جہاں ایک طرف ام المومنین حضرت عائشہؓ جیسی عظیم ہستی تھی تو دوسری طرف امیر المومنین حضرت علیؓ جیسے سابقون الاوّلون۔ اور دونوں طرف مسلمان!

حضرت عمارؓ جو حضرت علیؓ کے حامیوں میں تھے اس وقت ایک لرزہ خیز ذہنی کش مکش کے بھنور میں پھنس کر رہ گئے۔ وہ کیا کریں آخر؟ کیا حضرت علیؓ کا ساتھ چھوڑ کر گویا اس موقف کا ساتھ چھوڑ دیں جو ان کے نزدیک حق تھا؟ ـــــ یا اس حق کے دفاع میں اس ہستی کے خلاف تلوار اٹھائیں جو رسول اللہؐ کی محبوب ترین بیوی اور ساری امتِ اسلامیہ کی محسنہ ماں تھی ـــــ کتنے ہی ایسے لوگ تھے جن کے دل و دماغ کو یہ جانکاہ کش مکش پیسے ڈال رہی تھی، اور کتنے ہی لوگ تھے جو کوئی راہِ نجات نہ پاکر گوشۂ تنہائی میں جا چھپے تھے "تو کیا میں بھی میدانِ عمل سے ہٹ جاؤں؟ اور کسی کونے میں جا کر منھ چھپا لوں؟ ـــــ حالانکہ میرے نزدیک علیؓ کی حمایت اس وقت حق کی حمایت ہے اور اُم المومنینؓ کا موقف ایک اجتہادی غلطی ہے؟" حضرت عمارؓ نے سوچا اور فیصلہ کیا کہ وہ ہرگز حق کی حمایت سے نہیں ہٹیں گے خواہ یہ جذباتی عقیدت کی دو دھاری کش مکش ان کے دل و روح کو پارہ پارہ کر ڈالے جو ام المومنینؓ کے لیے ان کے مومنانہ سینے سے اُبل رہی ہے۔

شخصیت پرستی اور حق پرستی کی جنگ میں حضرت عمارؓ نے جو قربانی پیش کی آخر اس سے بڑی قربانی اور کیا ہو سکتی ہے؟

وہ اگرچہ اس جنگ میں شہید نہیں ہوئے بلکہ جنگِ صفین میں جام شہادت نوش کیا جس میں ایک طرف حضرت علیؓ تھے اور دوسری طرف حضرت معاویہؓ۔ لیکن حق یہ ہے کہ جنگ جمل میں ان کی "روح" شہید ہو چکی تھی اور جنگ صفین میں جسم نے شہادت پائی۔ جنگ جمل میں حق کے لیے اپنے جذبات کا خون کر لینے کے بعد وہ جنگِ صفین میں زخم پر زخم کھا رہے تھے کہ ان کو شدید پیاس لگی، پانی مانگا تو کسی نے دودھ پیش کر دیا۔ دودھ کی صورت دیکھتے ہی انھیں ماضی کی ایک حسین یاد آئی اور خوشی کے جوش میں آنکھیں تر ہو گئیں ـــــ یہ دودھ۔ یہ ان کی شہادت کا پیش خیمہ تھا ـــــ "شہادت" جس کی تلاش میں ان کی ایک عمر بیت گئی تھی اور ان کے شوق کے پاؤں میں چھالے پڑ گئے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ ولولۂ ایمانی اور جذبۂ شہادت سے جھومتے ہوئے حضرت عمارؓ کو آواز آئی کہ "جو آخری گھونٹ تم پیو گے وہ دودھ ہو گا....."

خدا سے ملاقات کے تصور نے ان کے دل میں خوف اور امید کی عظیم ایمانی ہلچل برپا کر دی۔ انھیں محسوس ہوا کہ تلواروں کی دھار ان کی گردن کو مقناطیسی کشش سے کھینچ رہی ہے ـــــ اللہ کی رحمت اور بندہ نوازیاں ان کی طرف باہیں پھیلا رہی ہیں ـــــ اور ان کے ہر ہر رونگٹے سے خون حیات کے ہر ہر قطرے سے ان کے فرض کی آخری پکار بلند ہو رہی ہے۔

"نامۂ اعمال کے آخری ورق پر جو کچھ لکھنا ہو اپنے خون سے لکھ دے!
ـــــ اے عمر بھر خدا کو یاد رکھنے والے!
جلدی کر! ـــــ کہ خود خدا تجھے اب اپنی بارگاہِ خاص میں یاد فرما رہا ہے۔"

عمارؓ والہانہ اُٹھے اور جہاد و عزیمت کے شعلہ زار میں بیتابانہ اپنے بال و پر جلانے لگے ـــــ آخر ایک سب سے حسین زخم لگا ـــــ ایک "زخم" جو شہادت کا جاں نواز پیغام لاتا ہے ـــــ ایک "زخم" جس کے بعد انسان

کے خون کا پہلا قطرہ ٹپکتے ہی جنت خود سامنے آکھڑی ہوتی ہے ـــــ ایک زخم جس کے لہو کی ہر بند پر خدا کو بے انتہا پیار آتا ہے۔ وہی عمارؓ جو کبھی نعمت ایمانی کھو جانے کے موہوم خوف سے حضورؐ کے قدموں میں پھوٹ کر روئے تھے آج خود اپنے لہو میں نہائے ہوئے اللہ کے قدموں میں اس طرح پڑے تھے کہ اب ان کے لیے نہ کوئی خوف خوف تھا اور نہ کوئی غم غم! ـــــ آنسوؤں کا تحفہ پیش کرنے والے نے آج اللہ کو اپنے خونِ حیات کا آخری تحفہ پیش کر دیا تھا ـــــ ہائے کتنا خوش بخت تھا وہ خدا کا بندہ جس نے خدا کو اس کے دونوں محبوب ترین قطرے پیش کیے تھے اور پھر حقیقی معنے میں خدا کو پیارا ہو گیا تھا! ـــــ خدا کو کتنا پیارا ہوا تھا یہ شخص۔ اس عظیم حقیقت کا کچھ اندازہ حضرت معاویہؓ کے ایک سپہ سالار اور ایک جلیل القدر صحابیٔ رسول حضرت عمرو بن العاصؓ کے الفاظ سے کیجیے! ـــــ یہ الفاظ ان کے ہونٹوں سے اس وقت جدا ہوئے جب نامعلوم گروہ کے دو آدمی باہم جھگڑتے ہوئے ان کے پاس آئے اور ان میں سے ہر ایک نے حضرت عمرو بن العاصؓ کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ حضرت عمارؓ کو اس نے ہی شہید کیا ہے ـــــ ان لوگوں کو یہ دھوکا تھا کہ حضرت عمرو بن العاص جو اس وقت حضرت معاویہؓ کی طرف سے حضرت علیؓ کی فوجوں سے مصروفِ جنگ تھے اس اطلاع پر بہت خوش ہوں گے کہ حضرت علیؓ کے اتنے بڑے ایک حمایتی کو ختم کر ڈالا گیا ہے ـــــ لیکن یہ دیکھ کر ان کے دل و دماغ پر بجلی سی گر گئی کہ اس اطلاع کو سنتے ہی حضرت عمرو بن العاصؓ کا چہرہ شدید نفرت سے تمتما اٹھا اور پھر خوف و غم سے پیلا پڑ گیا۔ انتہائی دلفگار نیم مدہوشی کے سے عالم میں وہ بڑا بڑا رہے تھے۔

"قسم اللہ کی ..... یہ دونوں ..... دوزخ کے لیے لڑ جھگڑ رہے ہیں ..... قسم اللہ کی!! میرا جی چاہتا ہے کہ ..... میں ..... اب سے بیس برس پہلے مر گیا ہوتا!"

کتنے قیمتی تھے اور کس قدر نورانی الفاظ تھے یہ! ـــــ جو ایک طرف عمارؓ کی عظمت پر روشنی ڈالتے ہیں تو دوسری طرف اس عظیم تاریخی معمّے کے حل کی طرف اشارہ بھی کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمارؓ کو شہید کرنے والے جس "باغی گروہ" کا ذکر فرمایا تھا کیا وہ حضرت معاویہؓ کا گروہ تھا یا وہ پراسرار و نامعلوم گروہ تھا جس سے عمارؓ کے قتل کو اپنا کارنامہ بنانے کے لیے یہ دونوں لڑنے جھگڑنے والے خون آشام تعلق رکھتے تھے۔ ظاہر ہے حضرت معاویہؓ کے گروہ کے جذبات کی ترجمانی تو حضرت عمرو بن العاصؓ کے ان الفاظ سے ہو جاتی ہے اور اس "نامعلوم باغی گروہ" کی خوں آشام ذہنیت کے آئینہ دار یہ دونوں اجنبی آدمی تھے۔

خدا سے ہمیں بھی ضرور ملاقات کرنی ہے۔

خدا جانے کب؟ ـــــ خدا جانے کہاں؟؟

کتنی بڑی ہوگی وہ ملاقات جب ایک عبدِ کم ترین اپنے معبود اکبر سے ملے گا ـــــ جب مخلوق یہ دیکھے گی کہ خود اس کا خالق اکبر اس کے سامنے ہے!

خدا کی قسم! اے لوگو! ـــــ کیسے اچھے تھے وہ لوگ جو اس جلوہ گاہ کی طرف اس شان سے گئے کہ اس ملاقات کے موقع پر خدا کو نذر کرنے کے لیے خدا کا کوئی محبوب تحفہ ان کے کفن میں موجود تھا! ـــــ ہائے افسوس! ان کفنوں کی جھولیاں جن میں بدن کی بھی لاش ہو اور ایمان و عمل کی بھی! ـــــ کاش ہمیں بھی اس ملاقات ـــــ یقینی ملاقات کا کوئی خیال آتا ـــــ آتا اور تڑپا دیتا ـــــ کاش کبھی ہم بھی تو اسی خوف کا احساس کر سکتے جس اندیشہ نے اُس دن حضرت عمار رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی جان ہی نکال دی تھی جس دن ان کی زبان کی محض نوک کو زبردستی کہلائے گئے چند کفریہ

الفاظ کی آنچ چھو گئی تھی ـــــ حالانکہ ان کا دل ایمان پر بالکل مطمئن تھا۔
ـــــ اور ہمارے دل! ـــــ ہائے ہمارے دل!! ـــــ شاید یہاں
تو زبان و دل دونوں ہی طرف اس ہولناک اندیشے کی آتشیں لپٹ اٹھ رہی ہے
کہ "کیا ..... ہم ..... مسلمان ..... ہیں؟ ....."

○

وہ چنگاری خس و خاشاک سے کس طرح دب جائے
جسے حق نے کیا ہو نیستاں کے واسطے پیدا

○

مہ و ستارہ سے آگے مقام ہے جس کا
وہ مشتِ خاک ابھی آوارگانِ راہ میں ہے

منجدھار سے ساحل تک

مکے میں قریش کے ایک صادق و امین شخص نے اعلان کیا ہے کہ انسانوں کی حقیقی فلاح کے لیے میں خدا کا آخری پیغام لایا ہوں ۔" تیزی سے گشت کرتی ہوئی یہ سنسنی خیز خبر قبیلہ غفار کے ایک حق کے متلاشی انسان حضرت ابوذر غفاریؓ کے کانوں تک بھی پہنچی ـــــ یہ خبر سنتے ہی وہ چونک اٹھے !

چاروں طرف پھیلی ہوئی گھٹا ٹوپ تاریکی میں جیسے کوئی حسین ترین جگنو چمک اٹھا تھا۔ یہ دیکھ کر ان کا معصوم دل کیسا کیسا کڑھتا تھا کہ جھوٹ، گناہ اور ظلم نے انسانی بستیوں میں خوف ناک جنگلوں کی سی فضا پیدا کر دی ہے ۔ درندگی ہے کہ آدمی کی صورت سے ٹپکی پڑتی ہے ـــــ جیسے آگ اور خون کا ایک زبردست طوفان امنڈ پڑا ہے جس کے وحشی تھپیڑوں نے تمام سفینوں کو توڑ پھوڑ ڈالا ہے اور جو لوگ ابھی تک اس طوفان میں غرق نہیں ہوئے وہ سب ٹوٹے ہوئے خستہ حال تختوں سے لپٹے ہوئے ایک ایک کر کے منجدھار میں چکرا رہے ہیں اور کنارے کی حسرت میں تڑپ رہے ہیں ـــــ مگر کوئی نہیں جانتا کہ کنارا کہاں ہے اور وہاں کیسے پہنچا جا سکتا ہے؟

"کیا عجب ہے کہ یہ خبر درست ہو ! حضرت ابوذر غفاریؓ نے دل کی گہرائیوں میں غور کیا "کیا عجب ہے کہ جو بندے خود اپنی جانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے ڈالتے ہیں ان بدنصیبوں پر ان کے حقیقی خدا نے ترس کھایا ہو ....."

"حقیقی خدا" کے تصور سے ہی ان کے بے قرار و بے تاب سینے سے ایک زبردست ہوک سی اٹھی ـــــ "خدا" جس کو بھول کر، جس سے دور بھٹک کر آدمی سوائے جہنم کے اور کہیں نہیں پہنچ سکتا ۔ "خدا" جس کے بغیر سونے چاندی کے خزانے بھی سکون دل کو ڈسنے کے لیے منہ کھولتے ہیں ـــــ "خدا" جس کا یقین سینے میں چھپائے ہوئے

انسان کفن اوڑھ کر اور خود اپنے خون میں غسل کر کے بھی بے اختیار مسکرا دیتا ہے!

وہ نہ جانے کتنی دیر تک کیا کیا سوچا کیے ـــــ اور جتنا انھوں نے اس خبر پر غور و فکر کیا یہ خبر ان کے لیے اتنی ہی دلکش اور جاں نواز اور پر معنی ہوتی چلی گئی۔

"میرے بھائی!" آخر انھوں نے ایک عملی فیصلہ کرتے ہوئے اپنے بھائی سے سرگوشی کی۔ "تمھیں ابھی اور اسی وقت مکّے جانا ہوگا اور اس آدمی کے متعلق سب کچھ معلوم کر کے بہت جلد آنا ہوگا جس نے کہا ہے کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں۔"

اور ایک بھائی کی اس مقدس خواہش کے احترام میں دوسرا بھائی تلاش حقیقت کے اس حسین سفر پر روانہ ہوگیا۔ بھائی کے جانے کے بعد ان کی بیتابی انتظار امید و بیم کی قیامت سے دوچار تھی۔ ہر شے کی طرف سے نظر ہٹا کر اب وہ صرف مکّے کی طرف اپنے درد کی دوا کے لیے چشم براہ تھے ـــــ ان کا دل بیتاب تھا کہ زندگی کی سب سے بڑی حقیقت تیزی سے ان کے قریب آئے اور ان کی ایک ایک دھڑکن میں پیوست ہو جائے۔

آخر آخر .....

انتظار کی جانکاہ گھڑیاں بیت گئیں ـــــ انھوں نے دیکھا کہ ان کے بھائی مکّے کی طرف سے قبیلۂ غِفار میں واپس چلے آرہے ہیں۔ دور ہی سے انھوں نے آنے والے کے چہرے کا بغور مطالعہ کیا اور سفر کے تاثرات کا بینا بانہ جائزہ لینے کی کوشش کی۔ یہ محسوس کر کے ان کی آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں کہ ان کے بھائی کے چہرے پر ایک حسین ترین امید کی جاں نواز روشنی دکھائی دے رہی ہے۔

"کیا پتہ چلا .....؟" امید اور خوف کے دو آتشہ جذبات نے حضرت ابوذرؓ کے الفاظ میں تھرتھری دوڑا دی تھی۔

"گھبرائیے نہیں۔" ان کے بھائی نے ان کو دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ "میں ان سے مل کر اور دوسروں سے ان کے متعلق معلومات کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ تو خود بھی بڑے اچھے آدمی ہیں اور دوسروں کو بھی بڑی اچھی باتیں سکھاتے ہیں

—— اور ہاں وہ ایک ایسا عجیب و غریب کلام سناتے ہیں جو نہ شعر ہے اور نہ کہانت۔"
بھائی کا ایک ایک لفظ انھوں نے دل کے کانوں سے سُنا اور دل کی پیاس اور بہت کچھ جان لینے کے لیے بڑھ گئی —— وہ بے چین ہو گئے کہ کاش میں خود مکّے گیا ہوتا اور اپنی آنکھوں سے اس شخص کو دیکھا ہوتا جس کے تذکروں میں کانوں کے لیے اس قدر مٹھاس ہے —— جذباتِ شوق کے ہچکولے کھاتے ہوئے۔ وہ فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے اور قطعاً بے سر و سامانی کے عالم میں وجد کرتے ہوئے مکّہ کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ وہ دنیا میں دنیا کے بنانے والے کو ڈھونڈنے جا رہے تھے —— انھیں اس کھوئی ہوئی سیدھی راہ کی تلاش بیکل بنائے ہوئی تھی جس پر چل کر وہ اپنے معبود سے ملاقات کر سکیں۔

گرد و غبار میں اٹا ہوا ایک پرشوق مسافر دھوپ اور سائے سے بے نیاز —— اونچے نیچے ریگستانوں کی خاک چھانتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ وہ گرتے پڑتے مکّے میں داخل ہوئے اور سیدھے مسجد حرام میں چلے گئے —— کیا نازک سفر تھا یہ! —— وہ اس ہستی کو جانتے پہچانتے تک نہ تھے جس کی تلاش انھیں وطن سے دُور پردیس میں اس طرح کھینچ لائی تھی —— اور دوسروں سے پوچھتے ہوئے اندیشہ تھا کہ سچائی کے دشمن ان کی اس آخری امید کو توڑ نہ ڈالیں جو زندگی کی ہولناک تاریکیوں میں انھیں روشنی کی واحد کرن محسوس ہو رہی تھی۔"

سورج چڑھا —— ڈھلنے لگا۔ شام ہو رہی تھی اور اس پردیسی کے پاس کھانے اور ٹھکانے تک کا کوئی بندوبست نہ تھا۔ اپنے مہمان کے استعمال کے لیے خود خدا نے ایک پرخلوص میزبان کو بھیجا۔ یہ حضرت علیؓ تھے جنھوں نے اس پردیسی کو دیکھا اور اس کے متعلق کچھ اور پوچھ گچھ کرنے کی کوئی ضرورت سمجھے بغیر مہمان نوازی کے پرشوق بازو پھیلا دیئے۔ وہ انھیں اپنے گھر لے آئے اور استطاعت بھر میزبانی کی۔ لیکن مہمان نے اس رات اپنے راز پر سے نقاب نہ اٹھایا۔ دوسرے دن وہ پھر خانہ کعبہ میں جا پہنچے کہ شاید وہ اس آرزو کو پا سکیں جس کے انتظار میں ان کے روح و دل

میں جذبات نے ہلچل ڈال رکھی تھی۔ دوسری رات وہ پھر حضرت علیؓ کے حصے میں آئے ـــــ اسی طرح تیسرا دن کٹا اور تیسری رات آ پہنچی ـــــ آج بھی وہ حضرت علیؓ کے مہمان تھے۔ آج رات میزبان نے یہ بھی اپنا اخلاقی فرض سمجھا کہ مہمان کا مقصدِ سفر معلوم کر کے اس کام میں اس کا ہاتھ بٹائے ـــــ اور آج رات حضرت ابوذرؓ بھی دل کی بات ہونٹوں پر لے آئے۔

"میں کل صبح تمھیں حضرت محمدؐ کے پاس لے چلوں گا۔"

حضرت علیؓ نے مسرت انگیز آواز میں تسلی دی۔ "لیکن اگر راہ میں کوئی ایسا شخص مل جائے جس کی موجودگی میں تمھارا میرے ساتھ دیکھا جانا مناسب نہ ہو تو میں جوتا ٹھیک کرنے یا پیشاب کرنے کے بہانے رک جاؤں گا اور تم چلتے رہنا۔"

انتظار کی یہ پہاڑ سی رات بھی کٹ گئی ـــــ صبح کی روشنی میں وہ حضرت علیؓ کے ہمراہ درِ رسولؐ پر حاضری دینے کے لیے چلے جا رہے تھے۔ بارگاہ رسالت میں داخل ہوئے تو ان کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی اور جیسے ہی ان کی پہلی نظر خاتم النبیینؐ کے روشن زرین چہرے پر پڑی انھیں محسوس ہوا کہ دل کی ہر ایک دھڑکن میں چراغ سے روشن ہو گئے ہیں۔ عقیدت کا سیلاب تھا جو حضرت ابوذرؓ کے پورے وجود سے پھوٹ نکلا تھا اور اجنبیت کا سارا احساس شکوک و شبہات کے تمام اندھیارے ایک ہی نظر میں کافور ہو گئے تھے۔ وہ جانچ پرکھ کے جانے کیا کیا ذہنی نقشے بنا کر لائے تھے ـــــ مگر یہاں تو تلاش حقیقت کا پورا سفر ایک ہی نظر میں طے ہو گیا ـــــ دو چار باتیں ہوئیں اور دل کی تمام گرہیں ایک ایک کر کے کھلتی چلی گئیں ـــــ قبیلہ غفار کا جگر پارہ بیتابانہ اٹھا اور ساری دنیا سے کٹ کر آغوش ایمان و اسلام میں آ گرا۔

"ابھی تمھیں اپنے ایمان کا اظہار کرنے کی ضرورت نہیں۔" غریب الدیار نو مسلم کو سہولت و آسانی کے مذہب کی رخصت عطا کرتے ہوئے حضورؐ نے تسلی دی ـــــ

"اب اپنے قبیلے میں واپس جاؤ اور جب ہم غالب آ جائیں تو ادھر پلٹ آنا۔"

"یارسول اللہؐ!" جوشِ ادب اور شدتِ ایمانی سے کانپتی ہوئی آواز حضرت ابوذرؓ کے ہونٹوں سے بلند ہوئی۔ "اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے میں تو اس کلمہ حق کو اُن بے ایمانوں کے اندر گھس کر چلّا کر پڑھوں گا!" اور سچ مچ انھوں نے ایسا ہی کیا!۔

وہ غیرتِ حق سے بے قرار ہو کر اُٹھے ـــــ جوش کے عالم میں روانہ ہوئے ـــــ بے تحاشا خانہ کعبہ میں داخل ہوئے اور مشرکوں کی بھیڑ میں گھس کر پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے چیختے ہوئے اعلان کیا:

"میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود ہے ہی نہیں ـــــ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ خدا کے رسول ہیں۔"

خدا کے باغیوں نے یہ اعلانِ حق کی گرج سُنی اور ایک لمحہ کے لیے ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ لوگ حیران تھے کہ یہ کون شخص ہے جس نے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ اعلان کیا ہے؟ ـــــ اور دوسرے ہی لمحے حق کے اس اعلان کے خلاف دار و گیر شروع ہو گئی ـــــ بے رحمانہ جنون کے عالم میں انسانی درندے اٹھے اور ایک انسان کو ہر طرف سے لپٹ گئے۔ ہاں دیوانوں اور درندوں کا پورا مشتعل ہجوم اکیلے بندہ مومن پر ٹوٹ پڑا تھا۔ گھونسے تھے کہ پے در پے پڑ رہے تھے۔ ٹھوکریں تھیں کہ ہر طرف سے لگ رہی تھیں۔ گالیوں کی طوفانی بوچھار تھی ـــــ لاف و گزاف کا طوفانِ بدتمیزی برپا تھا ـــــ اور ان یورشوں کے نرغے میں کھڑا ہوا مومن صبر و استقامت کا مینارۂ نور بنا ہوا ایستادہ تھا ـــــ دنیا اس بات پر آگ بگولا تھی کہ اس نے دنیا کے بنانے والے کا نام کیوں لیا ہے ـــــ مگر بندۂ مومن مطمئن تھا کہ اس نے یہ اتنی بڑی بات کہی ہے جس کو سننے تک کی تاب دوسروں میں نہیں تھی۔ اس نے گالیوں کے جواب میں اُف تک نہ کی ـــــ ٹھوکریں کھائیں اور کوئی فریاد تک نہ کی۔ وہ اپنا کام کر چکا تھا، وہ اپنی بات کہہ چکا تھا اور اب سہنے کی باری تھی ـــــ اسے خوف نہیں مکمل اطمینان تھا کہ خدائے کائنات اس کی پشت پناہی پر ہے۔ اس کو کوئی غم نہ

تھا، دلی خوشی تھی کہ وہ خدا کی گلی میں زدوکوب کیا جا رہا ہے اور اس کے جذبۂ وفا کا یہ منظر اس کا خدا دیکھ رہا ہے۔ جسمانی درد و کرب کے تمام احساسات اس لطیف احساس میں گم ہو چکے تھے کہ اس مشت خاک کی طرف رحمٰن و رحیم خدا کی نظرِ خاص اٹھی ہوئی ہے۔

سہنے والا سب کچھ سہہ رہا تھا مگر دیکھنے والوں کے کلیجے منہ کو آنے لگے۔ شرافتِ انسانی کا درد اُٹھا اور اس درد سے تڑپتے ہوئے حضرت عباسؓ جو ابھی تک لذتِ ایمان تک نہ پہنچے تھے شرافتِ انسانی کے جوش میں آگے بڑھے ـــــ اور مظلوم کے اوپر خود کو ڈالتے ہوئے ظالموں کو للکارا :

"دیوانو! تمھیں کچھ ہوش بھی ہے ؟ ـــــ یاد رکھو کہ اگر قبیلۂ غفار کا یہ فرد مارا گیا تو تمھیں شام کے کاروباری سفر میں اس کے قبیلے میں سے گزرنا ناممکن ہو جائے گا۔"

عذابِ آخرت کے بے فکروں نے جوں ہی مفاداتِ دنیا کے نقصان کا خطرہ محسوس کیا ہوش ٹھکانے لگ گئے اور اس طرح درد و کرب کے بوجھ تلے سسکتے ہوئے مومن کی جان خدا خدا کر کے بچ سکی۔

لیکن دوسرے دن اس سے بھی بڑا واقعہ پیش آیا ـــــ

خدا کی قسم ابھی جسم کی درد بھری چوٹوں پر ایک رات و دن کا وقت بھی نہ گزرا تھا کہ غیرتِ ایمانی کی چوٹ کھانے والا پھر اسی وادیٔ قہر و ستم کی طرف بڑھتا ہوا نظر آیا ـــــ ہائے وہ رِستے ہوئے زخموں پر ایک اور زخم تازہ کھانے کا ولولۂ ایمانی ـــــ اور ہائے وہ "اعلانِ حق" جو بزمِ ازل میں تمام انسانی روحوں نے اپنے خدا کے حضور کیا تھا مگر پھر دوبارہ تازہ کرنے کے لیے اشکبار آدمؑ زمین پر اترے ـــــ نوحؑ نے ساڑھے نو سو ۹۵۰ برس تک خونِ دل و جگر ٹپکایا اور عالم گیر طوفان میں اپنا سفینہ خدا کے بھروسے پر چلایا ـــــ ابراہیمؑ نے آگ کے بھڑکتے ہوئے الاؤ میں خود کو بے خوف و خطر ڈالا ـــــ یوسفؑ نے جیل کاٹی ـــــ موسیٰؑ فرعونی طاقت سے ٹکرائے اور بپھرے ہوئے دریا کا سینہ چیرتے ہوئے نکلے ـــــ عیسیٰؑ نے پھانسی کا تختہ دیکھا ـــــ اور پھر صدہا انبیاءؑ کی پوری تاریخ درد و کرب اکیلے محمدؐ نے ۲۳ سال تک دہرائی۔

کیسے صاحب نصیب تھے ابو ذر غفاریؓ! ـــــ کہ اسی "اعلانِ حق" کی سعادت دوسری بار ان کے حصے میں آ رہی تھی ۔

اس اعلان حق نے جس کو باطل نے کبھی معاف نہیں کیا آج تو جیسے بھڑوں کے چھتے کو بُری طرح چھیڑ دیا تھا ـــــ ظلم وستم کی قہرمانی طاقتیں زخمی ناگ کی طرح اٹھیں اور بندۂ مومن پر حملہ آور ہوئیں ـــــ یقیناً اگر آج پھر خدا کے فضل سے حضرت عباسؓ دوبارہ آڑے نہ آجاتے تو حضرت ابو ذرؓ کا کام ہی تمام ہو چکا ہوتا ـــــ آج وہ شہید ہو چکے ہوتے ـــــ "شہید" ـــــ وہ ممتاز جنتی جو جنت کی ٹھنڈی ہوا کھانے کے بعد یہ آرزو کرتا ہے کہ وہ پھر اسی دنیا میں واپس کیا جاتا تاکہ ایک بار پھر شہید ہو۔ زندہ ہو اور پھر شہید کیا جائے ـــــ پھر زندہ ہو پھر شہید کیا جائے ۔ زخموں اور چوٹوں سے پارہ پارہ وہ جسم اٹھا جس کو حق کے نام پر خاک وخون میں مل جانے کی آرزو تڑپا رہی تھی ـــــ وہ شہادت کی تڑپ میں کھنچے کھنچے آئے تھے اور شہادت کی آرزو اپنے ہر ہر زخم میں شعلہ زن کیے ہوئے واپس جا رہے تھے ۔

اللہ اللہ! کیسے تھے وہ لوگ جو ہم سے پہلے اسی اسلام کے دائرے میں دیکھے گئے! ان کے کارنامے ان کے ساتھ ساتھ گئے اور ہمارے کرتوت ہماری جان کے لاگو ہیں ـــــ وہ اہلِ حق تھے جنھوں نے حق کی قیمت پہچانی اور حی جان سے یہ قیمت چکانے کی پروانہ وار کوشش کی ـــــ اور ہم "حق فروش" ہیں کہ دنیائے فانی کے چند ٹکوں میں ہم نے سدا کی راحتوں کو ہنسی خوشی بیچ ڈالا ہے ہائے ہم!! جو اس دنیا سے لپٹے جاتے ہیں جو ہمیں اپنے سینے سے نوچ کھسوٹ کر منوں مٹی کے نیچے گاڑ دینے والی ہے ـــــ اور اس خدائے رحیم وکریم سے گریزاں ہیں جس کی رحمتِ بیکراں عمر بھر کے مجرموں کی آنکھ میں دو آنسو دیکھتی ہے تو جوش میں آجاتی ہے اور شہیدِ وفا کے خون کا پہلا قطرہ زمین پر ٹپکتے ہی جنت کے دروازے کھول دیتی ہے ۔

"پل صراط" نزدیک ہے

حضرت ابوذر غفاریؓ ـــــ

جن کا غیور خون ـــ غیرتِ حق سے گلنار اور حمیتِ بندگی سے سرشار خون رگوں میں چپ چاپ دوڑنے پھرنے کے بجائے رگ و پے سے ٹپک پڑنے کا قائل تھا جنھوں نے اللہ کے قدموں میں سر رکھتے ہی اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں میں ہاتھ دیتے ہی یہ محسوس کیا تھا کہ آخرت اس دنیا سے کہیں زیادہ بڑی اور قیمتی حقیقت ہے ـــ محسوس کیا تھا کہ اب دنیا کی بڑی سے بڑی قہرمانیت سے آنکھیں چار کر کے یہ زلزلہ انگیز اعلان کر سکتے ہیں کہ "محمدؐ جس خدا کے رسول ہیں یہ ساری کائنات اسی خدا کی ہے ـــ اسی خدا کی غلام ہے۔"

ابوذر غفاریؓ ـــــ

جو گوشت پوست کا ایک ڈھیر نہیں محمدؐ کے فولادی یقین کی زبردست گونج تھے۔ وہ ایک "ایمان" تھے جو کڑک رہا تھا ـــ وہ ایک برق تھے جو تڑپ رہی تھی ـــ وہ روح کی ایک ولولہ انگیز چیخ تھے ـــ وہ دل کا ایک جذبۂ بے قرار تھے ـــ وہ ایک "رقصِ شرر" تھے جو بے چین تھا کہ گھٹا ٹوپ تاریکیوں پر دیوانہ وار جست کرے اور اندھیروں کا سینہ چیرتا ہوا پھر اسی خاک میں مل جائے جہاں سے وہ پہلی بار بلند ہوا تھا اور جہاں سے اسے ایک بار پھر اٹھنا تھا۔

لیکن یہی جذبۂ بیقرار ـــ یہی شعلۂ بغاوت جو بڑے سے بڑے باطل پر بجلیاں گرا دیتا تھا جب اس آدمی کے روبرو ہوتا جس کا حسین اور عظیم نام "محمدؐ" تھا تو پھر اس کی والہانہ عاجزی و سپردگی کا عالم ہی کچھ اور ہوتا۔ حق و صداقت کا کتنا بڑا پیکر ہوگا وہ وجودِ انسانی جس کی جنبشِ نظر پر ابوذرؓ جیسے نڈر اور بے جگر انسان کی دھڑکنیں رقص کرتی تھیں ـــ مختلف صحابہؓ نے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی "جامع کمالات" شخصیت سے اپنے اپنے ذوق و صلاحیت کے مطابق فیوض و کمالات کی دولت سمیٹی تھی۔ مگر ابو ذر غفاریؓ کے حصے میں حضورؐ کا محض زہد و فقر ہی آیا تھا۔ یہ زہد و فقر ان کے اندر اور باہر اس طرح چھایا ہوا تھا کہ حضورؐ نے ان کے زہد و فقر کو حضرت عیسیٰؑ ابن مریمؑ کے زہد و فقر سے مشابہ قرار دیا۔

اسلام قبول کرنے سے پہلے وہ ایک بہت بڑے "ڈاکو" رہ چکے تھے لیکن پھر ان کے اندر ہی اندر ایک عظیم انقلاب پیدا ہونا شروع ہوا۔ ان کے دل نے گواہی دی کہ اس ساری کائنات کا خدا ایک ہی ہے۔ توحید کی یہ چنگاری ان کی راکھ میں شعلہ زن ہوئی تو خدا کے بندوں کو لوٹنے والا بے چین ہو گیا کہ وہ خود ہی راہِ مولا میں کہیں لٹ جائے۔ اب وہ دولتِ دنیا سے بیزار ہو کر دولتِ دین ڈھونڈ رہے تھے۔ اب انھیں اس خدا کی تلاش بیقرار کیے ہوئے تھی جس کا یقین ان کے قلب و روح کے اندر جاگ اٹھا تھا۔ پھر جب اس "حقیقتِ منتظر" کی جاں نواز آہٹ پا کر وہ کشاں کشاں آنحضرتؐ کی خدمت میں باریاب ہوئے تو نگاہِ اولین ہی میں حضورؐ کی دلنواز آنکھوں میں حقیقت کی تجلی دیکھ لی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خدا اور اس کے رسولؐ کے ہو کر رہ گئے۔ خدا ہی جانے دامنِ رسولؐ میں انھیں کون سی "دولت" نظر آئی تھی کہ جس کے بعد سونے اور چاندی کو انھوں نے مٹی کے ڈھیر میں بدلا ہوا پایا اور پھر اپنی فقیرانہ زندگی پر انھوں نے دولت و حکومت کا سایہ تک نہ پڑنے دیا۔ ان کو حضورؐ سے اور حضورؐ کو ان سے اپنائیت کا ایسا زبردست تعلق تھا کہ حضورؐ نے اپنے بستر وفات پر بھی ان کو یاد فرمایا تھا اور زندگی میں اپنی محفل میں سب سے پہلے تخاطب کا شرف بھی انھیں کو عطا فرماتے تھے آخری وقت میں جب وہ حضورؐ کے بستر پر تشریف لائے تو خوف و غم سے لرزتے ہوئے ان کے وجود کو آنحضرتؐ نے اپنے سینے سے چمٹا لیا تھا۔ ہائے وہ سینہ جسے محمدؐ کے مقدس سینے سے لمس کا شرف حاصل ہوا تھا۔

اور آہ! خدا کے آخری رسولؐ سے یہ ان کی آخری ہم آغوشی! ـــــ آغوشِ رسالت کی اس گرمی اور گرم جوشی نے ان کے سوزِ آخرت کو اس حد تک گرما دیا تھا

کہ پھر وہ کبھی اس دنیائے فانی کو گلے لگانے کا تصور تک نہ کر سکے ـــ پھر تو یہ دنیا آخرت کے اس دور افتادہ راہی کے لیے ایک درخت کی چھاؤں سے زیادہ کچھ نہ رہی جس کے نیچے بہت دور جانے والا مسافر تھوڑی دیر کو سستا تو سکتا ہے ـــ پاؤں پھیلا کر سو نہیں سکتا۔ سو بھی جائے تو بقدرِ ضرورت ـــ پھر تیز تیز اپنی راہ چل دیتا ہے۔

حضورؐ کی زندگی میں صرف ایک بار انھوں نے کسی جگہ کی امارت کی خواہش ظاہر کی تھی اور انھیں بارگاہِ رسالت سے جواب ملا تھا:

"اے ابوذر! ـــ تم ناتواں ہو ـــ میں تمھارے لیے وہی چیز پسند کرتا ہوں جو مجھے خود اپنے لیے پسند ہے۔"

یہ جواب سنتے ہی انھوں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دنیا کی سنہری گرد کو دامنِ شوق سے جھٹک دیا تھا۔ وہ فقر و زہد میں ڈوبتے چلے گئے تھے آخرت سے نزدیک تر اور جیتے جی دنیا سے دُور تر ہوتے چلے گئے تھے۔

لیکن یہ دوری جو کبھی کبھی "رہبانیت" معلوم ہوتی تھی۔ حقیقتاً رہبانیت نہیں تھی ـــ وہ دنیا سے فرار نہیں ہوئے تھے بلکہ دنیا میں رہتے ہوئے انھوں نے دنیا کو چھوڑ دیا تھا ـــ اس کا صحیح اندازہ اس ملاقات اور گفتگو سے ہوتا ہے جو ان کے زہد و فقر کے اس خاص دور میں ان کے اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے درمیان ہوئی ـــ حضرت اشعریؓ سے ان کے گہرے روابط تھے مگر جب وہ گورنر بنائے جانے کے بعد حضرت ابوذر غفاریؓ سے ملنے آئے اور وہ "بھائی بھائی!" کہتے ہوئے ان کی طرف بڑھے تو حضرت ابوذرؓ نے ان کو دور ہٹاتے ہوئے کہا:

"اب تم گورنر ہو ـــ میرے بھائی کہاں۔"

لیکن دوسری ملاقات کے موقع پر جب حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ پھر ان کی طرف مشتاقانہ بڑھنا چاہتے تھے تو حضرت ابوذرؓ کی گفتگو نے یہ واضح کیا کہ ان کا حقیقی مفہوم کیا تھا۔ درحقیقت وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ اگر دولت و حکومت نے تمھاری

دولت دل کو لوٹ نہیں لیا ہے تو ہم تم بھائی بھائی ہیں ورنہ ایک دولت مند گورنر اور ایک فقیر میں بھائی بھائی کا رشتہ کہاں!

"تم نے کوئی بڑی بلڈنگ تو کھڑی نہیں کر لی؟" حضرت ابوذرؓ نے سوال کیا تھا۔

"جی نہیں۔"

"زراعت تو نہیں کرتے ـــــ مویشیوں کے گلّے تو نہیں رکھتے؟"

"نہیں نہیں۔"

"ہاں تو اب تم یقیناً میرے بھائی ہو۔" حضرت ابوذرؓ نے اخوت اسلامی کے سچّے احساس کے ساتھ کہا تھا اور خدا کے دو غلام بغل گیر ہو گئے تھے۔ ایک بار ابو مروان نے انھیں دیکھا کہ وہ ایک چادر باندھے ہوئے خدا کی پرستش کر رہے ہیں۔

"ابوذر!" ـــــ انھوں نے نماز کے بعد ان سے پوچھا۔ "کیا بس ایک ہی چادر رہ گئی ہے؟"

"اگر کوئی اور ہوتی تو تمھیں نظر نہ آتی۔" حضرت ابوذرؓ نے مسکرا کر جواب دیا۔

"لیکن" ابی مروان بولے "اس سے پہلے تو تمھارے پاس دو کپڑے تھے۔"

"ضرور تھے۔" حضرت ابوذرؓ نے کہا "مگر وہ کپڑے میں نے ان کے مستحقوں تک پہنچا دیئے۔"

"تم تو خود ہی ان کے مستحق اور ضرورت مند تھے" ابی مروان نے قدرے حیرت سے کہا۔

یہ سنتے ہی حضرت ابوذرؓ کے چہرے پر روحانی کرب کے آثار ظاہر ہوئے۔ ابی مروان کو غور سے دیکھا اور دل گرفتہ سی آواز میں کہا:

"خدا تمھیں معاف کرے۔ تم چاہتے ہو کہ دنیا کو بڑھایا جائے ـــــ تمھیں نظر نہیں آتا کہ ایک چادر میں باندھے ہوئے ہوں، دوسری مسجد کے لیے ہے کچھ بکریاں ہیں جن کا دودھ پیتا ہوں۔ کچھ خچّر ہیں جو بوجھ ڈھوتے ہیں۔ ایک خادم

ہے جو کھانا پکا کر کھلا دیتا ہے ـــــ بتاؤ آخر اس سے زیادہ اور کیا چاہیئے۔؟"

لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان بکریوں کا دودھ بھی وہ خود ہی نہیں پی لیتے تھے۔ دودھ کی یہ نعمت پاتے ہی انھیں منعمِ حقیقی کا خیال آتا تھا۔ پھر خدا کے ان بندوں کا خیال آتا جو ان کے آس پاس آباد تھے اور ان کا جو اپنے حصّے کا رزق حاصل کرنے کے لیے ان کے دسترخوان پر مہمان بن کر آتے رہتے۔ پڑوسیوں اور ہمسایوں کو دودھ سے شکم سیر کرنے کے بعد جو کچھ بچ رہتا وہ اور ان کی اہلیہ دونوں نوش جان فرما لیتے ورنہ ایسا بھی ہوتا کہ سارا دودھ اوروں کے حصے میں چلا جاتا اور ان کے لیے صرف شکرِ نعمت کی مٹھاس رہ جاتی۔ ان کے اوپر فقر و زہد کا جو غیر معمولی غلبہ تھا اس کے پیش نظر اندیشہ تھا کہ ان کے یہ مخصوص رجحانات کوئی خطرناک رنگ نہ لائیں اور ان اصحاب رسولؐ سے ٹکراؤ کی نوبت نہ آجائے جو دین و دنیا کا بوجھ اٹھائے ہوئے زندگی کا پل صراط طے کر رہے تھے۔ شاید اسی لیے آنحضرتؐ نے ان سے ایک بار پوچھا تھا:

"جب تمھارے اوپر ایسے حکمراں ہوں گے جو اپنا حصّہ زیادہ لیں گے تو اس وقت تم کیا کرو گے؟"

"تلوار سے کام لوں گا۔" حضرت ابوذرؓ نے عرض کیا تھا

"میں تم کو اس سے بہتر مشورہ دیتا ہوں۔" حضورؐ نے ارشاد فرمایا تھا۔ "ایسے میں تم صبر کرنا یہاں تک کہ مجھ سے آکر مل جاؤ۔"

ایک بار ابوذرؓ مسجد میں لیٹے ہوئے تھے۔ آنحضرتؐ تشریف لائے۔ مستقبل کے واقعات کی طرف غیبی اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

"ابوذر، جب تم اس جگہ سے نکالے جاؤ گے تو کیا کرو گے؟"

"اپنے گھر چلا جاؤں گا۔" انھوں نے عرض کیا "یا مسجد نبوی میں چلا جاؤں گا۔"

"اگر اس سے بھی نکالے گئے؟"

"تو پھر تلوار سے کام لوں گا۔"

جواب سن کر حضورؐ نے اپنا مقدس ہاتھ ان کے شانے پر رکھ دیا اور تین بار

ارشاد فرمایا:

"ابوذر! خدا تمھاری مغفرت کرے ـــــ تلوار مت نکالنا، جہاں وہ لے جانا چاہیں چلے جانا۔"

اور ـــــ تاریخ گواہ ہے کہ حضرت ابوذرؓ نے ایسا ہی کیا تھا۔ دورِ عثمانیؓ میں انھیں مشورہ دیا گیا کہ وہ ربذہ چلے جائیں اور وہ سیدھے اُٹھ کر وہاں چلے گئے تھے اور پھر وہیں گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی تھی وہاں کچھ لوگوں نے ان سے درخواست پر درخواست کی کہ وہ خلیفۂ ثالث حضرت عثمانؓ کے خلاف اٹھیں تو ہم پوری طرح ساتھ دیں گے لیکن انھوں نے فتنہ کا سر کچل دیا اور نماز تک کی امامت قبول نہیں کی ـــ ایک حبشی غلام کے پیچھے نماز پڑھی اور کہا "میرے خلیلؐ کا میرے لیے یہی حکم تھا" ـــ کیسا خوش نصیب تھا وہ انسان جو انس و جن کے سردار محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا "خلیل" کہہ سکتا تھا۔

اور کس قدر سچا ہوگا وہ انسان کامل ؐ جس کی ایسی والہانہ اطاعت ابوذرؓ جیسے [illegible] دشمن اور شمشیر برہنہ انسان نے کی!

ربذہ میں ان کی یہ فقیرانہ زندگی اس دَور سے تعلق رکھتی ہے جب ایک طرف اُمت [illegible] اختلافات کے شعلے اٹھ کر فتنوں کا رنگ اختیار کرتے جا رہے تھے تو دوسری طرف دولتِ دنیا کا ایک سیلاب تھا جو اُمنڈا چلا آ رہا تھا وہ ان دونوں سے بچنا چاہتے تھے اپنی تنہائی کی برکت سے وہ ان دونوں آزمائشوں سے محفوظ و مامون رہے۔ مگر ان کی بیوی کے لیے ان کی یہ عظیم زہد و فقر کی زندگی بڑی آزمائش ضرور بن گئی تھی۔

عمران بن اوطانؓ نے دیکھا کہ ابوذرؓ مسجد کے گوشۂ تنہائی میں سمٹے ہوئے اس طرح بیٹھے ہیں جیسے کوئی بڑے بھاری طوفان سے خود کو بچانے کی کوشش کر رہا ہو۔

"ابوذر!" ابن اوطان نے پوچھا۔ "یہاں اکیلے بیٹھے کیا کر رہے ہو؟"

حضرت ابوذرؓ نے درد بھری نظریں اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔ "میں نے اپنے آقاؐ

سے سُنا ہے کہ تنہائی بُرے ہم نشین سے بہتر ہے۔"

ابی اسماء اسی دور میں ان سے ملاقات کرنے کے لیے زبذہ پہنچے تو دیکھا کہ ان کی بیوی خستہ حالی کا شکار ہیں مگر ابو ذرؓ اسی فقر میں مست ہیں۔

"یہ عورت کہتی ہے۔" ابو ذرؓ نے اپنی بیوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پرسوز مسکراہٹ کے ساتھ کہا "کہ میں عراق چلا جاؤں۔ لیکن عراق جاؤں گا تو وہ لوگ میرے سامنے دنیا پیش کریں گے اور یہ بوجھ مجھے پل صراط پر اوندھے منہ گرا سکتا ہے ــــ نہیں میں اس بوجھ سے فارغ ہی رہنا چاہتا ہوں۔"

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ پھر ابو ذرؓ نے ایک درد بھری بات کہی:

"میرے محبوب نے بتایا تھا کہ جہنّم کے پل کے سامنے ایک پاؤں پھسلا دینے والا راستہ ہے اور ــــ تم لوگوں کو اس پر سے گزرنا ہے۔"

بیت المقدس میں احنف بن معیش کو ایک عجیب آدمی دکھائی دیا جس کا حال یہ تھا کہ وہ سجدے سے سر اٹھاتا تھا اور پھر سجدے میں گر جاتا تھا۔

احنف خاص اشتیاق و تجسّس کے ساتھ اس آدمی کے پاس گئے اور سلسلۂ گفتگو چھیڑنے کے لیے پوچھا۔

"کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ میں نے دو رکعتیں ادا کیں یا ایک رکعت؟"

"اگر مجھے نہیں تو خدا کو تو خبر ہے۔" اس شخص نے مختصر سا جواب دیا ــــ اس کے بعد خواب ناک انداز میں یہ لرزتے ہوئے الفاظ اس کے ہونٹوں تک آئے۔

"میرے دوست ابو القاسمؐ نے مجھ کو خبر دی ہے....." جملہ پورا نہ ہو سکا ــــ آواز گلوگیر ہو گئی۔

"میرے دوست ابو القاسمؐ نے مجھ کو خبر دی ہے کہ....." اتنا ہی بمشکل کہہ سکے تھے کہ پھر سینے سے ہوک اٹھی اور کوئی انھیں یاد آ گیا۔ ضبط کا بندھن ٹوٹ چکا تھا اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ تیسری بار انھوں نے پھر بات کرنے کی کوشش کی تو دل کی بات زبان تک آ سکی۔

"میرے دوست ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو خبر دی ہے کہ جو بندہ اللہ کو سجدہ کرتا ہے اللہ اس کا درجہ بلند کر کے اس کی بدی کو مٹا کر نیکی لکھ دیتا ہے۔"

"آخر آپ کون ہیں؟" پیہم سجدہ ریزیوں کا یہ پوشیدہ راز سمجھنے کے بعد احنف بن قیس نے عقیدت کے ساتھ سوال کیا۔ اس کے جواب میں سادگی، عجز، درد اور یادِ ماضی میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔

"ابوذرؓ ـــــ رسول اللہؐ کا صحابی ....."

غزوۂ تبوک کے موقع پر جب محاذ پر پہنچنے کے بعد حضورؐ کو یہ بتایا جا رہا تھا کہ کون کون اس مہم میں شامل ہونے سے رہ گیا ہے ـــ تو پیچھے رہ جانے والوں میں "ابوذرؓ ـــــ رسول اللہؐ کے صحابی" کا نام بھی لوگوں کی زبان پر آیا ـــ لیکن کسی کو خبر نہ تھی کہ راہ میں ان کی سواری سست پڑ گئی تھی تو اب وہ اپنا سامان کمر پہ لادے ہوئے رسول اللہؐ کے نقوشِ پا پر چھالے ٹپکاتے ہوئے چلے آ رہے تھے ـــــ چلے آ رہے تھے مستانہ وار ـــــ اپنے آپ سے بے خبر۔ خدا اور اس کے رسولؐ کی یادوں میں غرق۔ سراپا نیاز و اطاعت۔

"وہ کوئی آ رہا ہے!" کسی کی آواز بلند ہوئی۔

"ابوذرؓ ہوں گے۔" حضورؐ نے بلا تامل فرمایا۔

"خدا کی قسم ابوذر ہی ہیں۔" دوسری آواز آئی۔

"ابوذر پہ خدا رحم کرے۔" حضورؐ کے مقدس الفاظ سنے گئے۔ "وہ تنہا چلتے ہیں ـــ تنہا مریں گے اور ـــ تنہا اٹھیں گے۔"

اور واقعی ایسا ہی ہوا ـــــ ابوذرؓ نے زہد و فقر کی جو منفرد زندگی بسر کی تھی اس کا آخری سانس انھوں نے ایک ویرانے کی تنہائی میں لیا۔ صحرا میں ابوذرؓ اور اُن کی شریکِ حیات کے سوا دور دور تک کوئی نہ تھا۔

"اب کیا ہوگا؟" بے کسی اور بے سروسامانی کے احساس سے ان کی اہلیہ رو پڑی تھیں۔

"کیوں ..... کیوں روتی ہو؟" جسمانی ضعف اور ایمانی خوف کی دو آتشہ آواز میں حضرت ابوذرؓ پکارے تھے۔

"ہمارے پاس کفن کے لیے بھی کوئی کپڑا موجود نہیں اور آپ ..... آپ ..... اس ویرانے میں سفرِ آخرت کے لیے پا بہ رکاب معلوم ہوتے ہیں۔" آنسوؤں کے درمیان سے ان کی اہلیہ نے کہا تھا۔

"فکر مت کرو۔" جاں بلب صحابیؓ نے صحابیت کی مخصوص ایمان افروزیوں کے جلو میں لبوں کو جنبش دی تھی۔ "ہم چند آدمی حضورؐ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ تم میں سے ایک شخص صحرا میں جان دے گا اور اس وقت مسلمانوں کی ایک جماعت وہاں پہنچ جائے گی! ــــ میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ سب لوگ بستیوں میں مر چکے ہیں۔ اور وہ صحرا میں مرنے والا شخص میں ہی ہوں۔ خدا کی قسم! کہنے والے نے سچ کہا اور سننے والے نے سچ سُنا۔ جاؤ اور دیکھو کہ لوگ ضرور اِدھر آ رہے ہوں گے۔"

"حاجیوں کے قافلے اپنی اپنی راہ پر جا چکے۔" اہلیہ نے آہِ سرد بھرتے ہوئے کہا تھا۔ "راہیں ویران پڑی ہیں ــــ اب کون آئے گا۔" ــــ لیکن ابوذرؓ کے اصرار پر وہ ٹیلے پر چڑھیں تو دیکھا کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے ہمراہ چند لوگ ادھر چلے آ رہے ہیں اور حضرت ابوذرؓ کی وصیت کے مطابق ان کو سپردِ خاک کیا گیا۔ مرتے مرتے وہ دنیا کی گرد سے دامن جھٹکتے ہوئے گئے اور آخری وصیت کی:۔

"اگر میری بیوی کے پاس کفن بھر کا کپڑا نکل آئے تو مجھے اسی میں کفنایا جائے اور تمھیں قسم ہے کہ مجھے کوئی ایسا شخص کفن نہ پہنائے جس کے پاس حکومت کا معمولی سا بھی عہدہ ہو۔"

یہ تھے وہ لوگ جن کو یہ بات یاد تھی کہ خدا کی جنت پھولوں کی سیج کے نہیں، بلکہ ایک دھار دار پل صراط کے اُس پار ہے لیکن ہم ہیں وہ ظالم ناداں جو پل صراط کے ادھر اسی دنیا

میں اپنی محبت" دیکھنا چاہتے ہیں ـــــ وہ خالی ہاتھ رہنا چاہتے تھے تاکہ اس خوف ناک ترین، خطرناک ترین "پل" کو پار کر سکیں ـــــ لیکن ہم ہیں کہ دنیا اور اس کے بکھیڑوں سے سر سے پاؤں تک لدے پھندے ٹھیک اسی "پل" کی طرف بڑھے چلے جا رہے ہیں جو دوزخ کے بھڑکتے ہوئے الاؤ کے اوپر بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے بھی زیادہ تیز ہمارا منتظر ہے۔

ـــــ اگر ہمارا یہی عالم ہے تو کیا ہم اتنا بھی نہیں سوچ سکتے کہ ہمارا انجام کیا ہونا ہے؟ ـــــ یہ "سوچ" ایمان کا کم سے کم تقاضا ہے، اور جہاں یہ "سوچ" تک نہیں ہے وہاں "ایمان" کہاں ـــــ وہاں تو فقط بے جان دعوے ہیں۔ بے روح الفاظ ـــــ

سوچئے کیا ہمارے پاس یہ "سوچ" ـــ کم از کم یہ "سوچ" ہے؟ ـــــ
سوچئے ـــــ کیا ہم مسلمان ہیں؟ ـــــ

نہ ایراں میں رہے باقی نہ توراں میں رہے باقی
وہ بندے فقر تھا جن کا ہلاکِ قیصر و کسریٰ

اب تلک یاد ہے قوموں کو حکایت ان کی
نقش ہے صفحۂ ہستی پہ صداقت ان کی

جلا سکتی ہے شمعِ کشتہ کو موجِ نفس ان کی
الٰہی کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں!